امکان

امکان

من که از کلکِ نظامِ روزگار
نقشہا بر لوحِ امکاں می زنم
(عرفی)

امکان

(شعری مجموعہ)

مسلم شمیم

ترتیب

حسین انجم

کتابت : جاوداں لیزر کمپوزرس، کراچی

سرورق : بشیر موبد ناشر : جاوداں پبلشرز، کراچی

تعداد : ایک ہزار قیمت : ایک سو پچاس روپے

یہ نمونہ کلام جاوداں پبلشرز، ۲۸۔ ای، رضویہ سوسائٹی، کراچی۔ ۷۴۰۰۰ فون : ۶۲۳۲۵۱ سے طلب فرمائیے۔

فردنامہ

نام: محمد مسلم

قلمی نام: مسلم شمیم

والد کا نام: محمد ناظر حسین (مرحوم)

والدہ کا نام: شرف النساء

جائے پیدائش: ولی پور، پٹنہ (عظیم آباد)

تاریخ پیدائش: ۳/ جنوری ۱۹۳۹ء

بیگم اور بچے: عصمت شمیم بنتِ سید محمد لئیق (مرحوم)، خالد شمیم (انجینئر) شاہد شمیم (انجینئر)، عفت ریاض، شاذیہ یمی، نازیہ سدف، شاد شمیم (پوتا) اور شثا ریاض (نواسی)

بہنیں اور بھائی: صفیہ اور زہرہ، محمد شہاب، محمد رفیق، محمد شفیق، حسن ناصر اور محمد ظہیر۔

تعلیمی زندگی:

بی۔اے آنرز (سیاسیات) پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۵۶ء۔

ایم۔اے (سیاسیات) کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۹ء۔

ایم۔اے (اردو ادبیات) سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۷ء۔

ایل ایل۔بی، سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۳ء۔

معاشی تگ و دو: لکچرر (سیاسیات)، لاڑکانہ کالج آف کامرس اینڈ اکانومکس ۱۹۶۱-۱۹۶۲ء۔

جنرل مینجر سوویت پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، کراچی ۱۹۷۲ تا ۱۹۷۸۔

وکالت ۱۹۷۸۔ تا حال

جز وقتی صحافت: نمائندہ اے پی پی، لاڑکانہ ۱۹۶۳ - ۱۹۷۰۔

نمائندہ روزنامہ جنگ کراچی، لاڑکانہ ۱۹۷۰ - ۱۹۷۱۔

نمائندہ روزنامہ سن کراچی، لاڑکانہ ۱۹۷۱ - ۱۹۷۲۔

مدیرِ اعلیٰ - کالج میگزین المیزان اور ونجارا، لاڑکانہ ۱۹۶۲ - ۱۹۷۲۔

رکن مجلس ادارت: ہفت روزہ محور، کراچی ۱۹۷۸ - ۱۹۸۰، سہ ماہی جام جم سکھر ۱۹۶۰ - ۱۹۶۱۔

ماہنامہ طلوع افکار، کراچی ۱۹۸۹۔ تا حال

ماہنامہ اردو انٹرنیشنل، کراچی - ۱۹۹۰۔ تا حال

تنظیمی وابستگی: مجلس ادب سکھر ۶۰ - ۱۹۶۱ء، بزم ادب لاڑکانہ ۶۱ - ۱۹۶۳ء، انجمن ترقی اردو لاڑکانہ ۶۳ - ۱۹۷۳۔ پاکستان رائٹرس گلڈ، عوامی ادبی انجمن، کراچی، تا حیات رکن آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی، سندھ کلچرل کونسل کراچی، ادارہ فنون و ثقافت کراچی وسطی، انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی، افریشیائی انجمن مصنفین پاکستان، قومی کونسل برائے شہری آزادی اور جنرل سیکریٹری ترقی پسند مصنفین گولڈن جوبلی کانفرنس (۱۹۸۶ء) کراچی

تصانیف: امکان (شعری مجموعہ) طلوع (نثری مجموعہ) اور ہم سخن (مضامین)

عصمت شمیم

کے نام

منسوب ان کے نام جو کی اس کتاب میں
منظوم کچھ خطوط غزل کی زباں میں ہیں

مندرجات

امکان

امکان

امکان

امکان

ابتدائیہ

علومِ سیاسی کے سابق استاد، دیوانی مقدمات کے وکیل ، بائیں بازو کے دانشور اور ترقی پسند ادیب و شاعر حضرۃ مسلم شمیم میرے بہت محترم و عزیز دوست ہیں۔ ان کا تعلق ہندوستان کی مردم خیز سرزمین عظیم آباد (پٹنہ) سے ہے۔ عنفوانِ شباب تک بہار میں رہے شباب کی منزلیں لاڑکانہ میں طے کیں اور اب جب کہ ان کی عمر کی ندی شیب کی وادی کی طرف مڑ چکی ہے وہ پر شباب ہنگاموں کے شہر کراچی میں آ بسے ہیں۔

فی الجملہ اعتماد مکن بر دیارِ دہر
کاین کارخانہ ایست کہ تغیر میکنند (حافظ)

مسیں ٹھیک سے بھیگنے بھی نہ پائی تھیں کہ دل و جان سے شعر و ادب کی دیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے اور

ہوئے جوان تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

امکان

وہ آج بھی اس کل کی طرح جو نہ معلوم کتنے ماہ و سال کی گرد میں پوشیدہ ہے دیوانہ وار شیفتگی سے آراستگی۔ زلف سخن میں مصروف ہیں ؎

پریشاں کاکلی داری و من ہم شانہ ای دارم

مسلم شمیم صاحب بڑے بالغ النظر اور روشن فکر ادیب و شاعر ہیں۔ وہ نہ صرف نثر بہت اچھی لکھتے ہیں بلکہ شعر بھی بڑے آبدار کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق کے دو بہت واضح جذبے موجزن ہیں ان میں سے ایک حبِ جاناں کا اور دوسرا حبِ انساں کا ہے ؎

ہرآنکسی کہ دریں حلقہ نیست زندہ بعشق

بر او نمردہ بفتوای من نماز کنید (حافظ)

اور غالباً اسی بناء پر وہ اعلیٰ و ارفع اقدار کے علمی، ادبی و شعری کاموں میں جن کی فہرست خاصی طویل ہے نہ صرف میرے معین و مددگار ہیں بلکہ ان لوگوں کے بھی جن سے ان کا نظریاتی اختلاف ہے ؎

ورنہ ہر نخلی بپائے خود ثمر می افگند

اور یہ ایک ایسا وصف ہے جو فی زمانہ اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔
میں نے ذیل کے چار مصرعوں میں ان کے بعض اوصافِ حمیدہ نظم کئے ہیں، ملاحظہ کیجے۔

رند در میخانہ و ساجد بہ اصحابِ گلیم
در حضورِ مہوشاں پیغمبر بادِ نسیم
بہ ہمہ ایں طرفگی او ہرچہ القاء شد نوشت
در کتابِ شاعری اش حضرۃ مسلم شمیم

حسین انجم

پہلا ورق

مسلم شمیم پچھلے پینتیس برس سے ایک سی وارفتگی اور لگن کے ساتھ وہ سب کچھ جو تجربات و حوادث کی صورت میں انہیں ملا تھا، مترنم الفاظ میں ڈھال کر دنیا کو لوٹا رہے ہیں۔ دنیا والوں سے انہیں جو چرکے ملے، قسمت نے ان کے ساتھ جو کھیل کھیلا اور ارد گرد جو تماشہ ہوا نیز قریبی دوستوں کے اٹھ جانے سے جو خلا ان کی روح کے اندر پیدا ہوا، یہ سب ایک بوجھل آنسو کی صورت ان کی پلکوں سے چمٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ظلم و استبداد، ناانصافی اور اقربا پروری، استحصال اور بے مروتی اور اس طرح کے دیگر مظاہر انہیں زندگی بھر خون کے آنسو رلاتے رہے۔ چنانچہ ان کے ہاں لہو کا استعارہ قاتل اور قتل گاہ سے منسلک ہو کر ایک ایسی سیاسی اور معاشرتی فضا کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے جس میں سچ بولنے والے کو ہمیشہ رسن و دار کے سپرد کیا گیا ہے۔ رسن و دار سے مراد محض پھانسی کا پھندا نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ پابندیاں بھی ہیں جو فرد کی زبان بندی کا باعث بنتی ہیں۔ مسلم شمیم اگر اس ساری صورتِ حال کو ایک جذباتی میلو ڈرامائی انداز میں بیان کر دیتے تو اس سے مزاحمتی شاعری تو وجود میں آجاتی مگر "شاعری" راکھ ہی میں کہیں دبی رہ جاتی۔ چونکہ مسلم

شمیم ایک حساس شاعر ہیں، لہٰذا دیکھنے کی بات ہے کہ انہوں نے موجود صورتِ حال کو علامتی پیکر عطا کر کے کچھ کا کچھ بنا دینے کی کیسی عمدہ کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر زباں بندی اور ظلم و استحصال کی فضا کے لئے انہوں نے "تاریکی" کا لفظ استعمال کیا ہے اور ایک ایسی فضا کے لئے جو آزادیٔ اظہار اور رواداری سے عبارت ہو وہ "روشنی" کے لفظ کو بروئے کار لائے ہیں۔ گویا تاریکی اور روشنی کے دو سادہ الفاظ میں مسلم شمیم نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو شاید ہزاروں الفاظ پر مشتمل سیاسی اور نظریاتی بیانات کی گرفت میں بھی نہ آسکے۔ پہلے تاریکی کا منظرنامہ دیکھئے:

خرد کو تیرگی۔ کفر کا نقیب کہو
جنوں کی خیر شعورِ بشر کو قتل کرو
چار سو خوف تیرگی ہے بہت
شب کو احساسِ برتری ہے بہت
زنداں کی تیرگی ہو کہ مقتل کی خامشی
ہیں مطمئن کسی نہ کسی اعتبار سے
جنگل کو اپنے شہر کی تقدیر جانئے
اب روشنی کی بھیک اندھیروں سے مانگئے

یہ تیرگی محض شمعوں کے گل ہونے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ جبر کے وارد ہونے، قید و بند کے مسلط ہونے اور منافقت، ظلم اور استحصال کے چھا جانے کا نام ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مسلم شمیم نے تاریکی کو براہِ راست نشان زد کرنے سے کہیں زیادہ اسے روشنی کے عقب میں موجود دکھایا ہے۔ یوں وہ روشنی اور تاریکی کی اس آویزش کا منظرنامہ پیش کرتے نظر آتے ہیں جو کبھی خیر و شر کے باہمی ٹکراؤ میں متشکل ہو کر سامنے آئی تھی مگر جو اب انہیں معاشی اور معاشرتی سطح پر ظالم اور مظلوم

کی دوئی میں عام طور سے دکھائی دے رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مسلم شمیم نے تاریکی کے آگے (چاہے وہ جہالت کی زائیدہ ہو یا جبر اور استحصال کی) ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ اسے روشنی کے مظاہر سے شکست کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی شاعری یاسیت کی شاعری نہیں، امید اور روشن سحر کی شاعری ہے۔ روشنی سے ان کا لگاؤ اس قدر ہے کہ وہ سروں (بالخصوص بریدہ سروں) کو مشعلوں کا نام دیتے ہیں اور یادوں کو بھی مشعلیں قرار دیتے ہیں۔ اس طرح محبوب کو (چاہے وہ گوشت پوست کا محبوب ہو یا آدرش کا علامتی پیکر) روشنی کی صورت ہی میں دیکھتے ہیں۔ اور خواب کو بھی روشنی کی ایک قاش سمجھتے ہیں حد یہ کہ قلم کو بھی شمع قلم کہہ کر پکارتے ہیں۔ تاہم لہو کو چراغ کہنا انہیں بہت مرغوب ہے۔ مسلم شمیم کی شاعری کا ایک بڑا حصہ لہو کے چراغوں سے مستنیر ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کی مدد سے وہ اندھیرے کے جبر سے نجات پانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ روشنی کو تیرگی سے مات کھاتے دیکھنا مقصود ہو تو مسلم شمیم کے مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ ضروری ہے:

سروں کی مشعلوں سے اہل دل راہِ محبت میں
صلیبوں کو سجادیں زندگی خوش نام ہو جائے

حصارِ جبر و ستم میں دکھوں کی بستی میں
جلائے شمع قلم ہمکلام شب سے تھا

کوئے جاناں سے کوئی گذرا تھا کل شب سرخرو
خامشیِ مقتل کی کتنے راز افشا کر گئی

ظلمتِ شب سحر ڈھونڈ لے گی
گمرہی راہبر ڈھونڈ لے گی

حکم تازہ ہے ان کو گل کر دو
جن چراغوں میں روشنی ہے بہت

امکان

روشنی کا سفر مدام رہے
زخم ماتھے پہ تازہ تر رکھئے

شکستِ تیرگی کے ساتھ ہم اہلِ محبت پر
گلوں کی ترجمانی کا بھی اک الزام ہے ساقی

سروں کے چاند فروزاں ہیں راہِ الفت میں
چمک رہی ہے زمیں آج کہکشاں کی طرح

سروں کی مشعلوں کا تذکرہ ہے
سکوتِ شب کا وہ عالم نہیں ہے

لہو سے دردمندوں کے فق گلفام ہوجائے
شبِ غم سے الجھنے کی تمنا عام ہوجائے

فریبِ شب ہی ہی آج قصرِ ظلمت میں
سحر کی بات چلی ہے یہ بات لے کے چلو

قتلِ گل ، قتلِ صبا ، قتلِ سحر کی تقریب
منعقد ہوتی رہی بارہا ایوانوں میں

اِن اشعار پر ترقی پسند شاعری کے ایک خاص دور میں فروغ پانے والی ایمجری اور لفظیات کی چھاپ موجود ہے ۔ اگر مسلم شمیم اسی انداز میں شعر کہتے چلے جاتے تو شعراء کے اس انبوہ سے الگ نظر نہ آتے جو ایک خاص مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ عمل تھا اور ایک مخصوص جارگن میں اپنے نظریاتی جھکاؤ کی تشہیر پر بضد نظر آتا تھا مگر صاف نظر آتا ہے کہ مسلم شمیم کی شاعری جارگن کی اس جکڑ سے آزاد ہوئی ہے ۔ بالخصوص پچھلی ایک دہائی میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہر چند کہ تاریکی اور روشنی کی آویزش بدستور موجود ہے تاہم اب انہوں نے کلیشوں سے نجات

پالی ہے اب وہ ایسے اشعار کہہ رہے ہیں جن میں جہالت ، ظلم ، استحصال ، جبر اور زباں بندی پر ان کا حملہ براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہے ۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ترقی پسندی کے متذکرہ بالا دور میں قتل اور مقتل ، صلیب اور دار ، راہبر اور رہزن ، غمِ دوراں اور غمِ جاناں اور ایسے ہی دیگر الفاظ اور تراکیب کی مدد سے بھی اصل صورتِ حال کو براہ راست نہیں بلکہ اشارتاً ہی نشان زد کیا گیا تھا تو عرض ہے کہ جب لفظ یا لفظی ترکیب پر اس کے معنیٰ سکے پر کھدی تحریر بن جائیں تو وہ علامتی نہیں رہتے بلکہ " نشان " بن جاتے ہیں اور نشان ہمیشہ شفاف یعنی Transparent ہوتا ہے ۔ عجیب بات ہے کہ عام معاشی ، سیاسی اور معاشرتی زندگی میں تو Transparency ایک خوبی ہے جب کہ شاعری کی دنیا میں یہی سب سے بڑا عیب ہے کیونکہ شاعری میں معنیٰ کو نشان بنادینے کا مطلب اس کے معنیاتی پھیلاؤ کو روکنا اور اس کی قوتِ انعکاس کو ختم کرنا ہے ۔ بے شک شعر کا مہمل ہونا بھی ایک عیب ہے مگر اس میں ابہام کا در آنا عیب نہیں ہے ۔ اچھا شعر محض ایک معنیٰ تک محدود رہنے کے بجائے معانی کی کثرت کا مظاہرہ کرتا ہے .... معانی ، جو ایک دوسرے سے ٹکرا کر گنجل نہیں بن جاتے بلکہ ایک دوسرے کو سہارا دے کر معنیاتی توسیع پر منتج ہوتے ہیں ۔ ترقی پسند شاعری کے متذکرہ بالا دور میں بعض تلمیحات ، لفظی تراکیب اور امیجز کو اس فراوانی سے استعمال کیا گیا کہ وہ مآل کار کلیشوں اور نشانوں میں ڈھل کر شفاف ہوگئے اور ان کا علامتی پھیلاؤ رک گیا ۔ مسلم شمیم کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کلیشوں سے نجات پانے کی ایک قابل قدر مثال سامنے آئی ہے ۔ پچھلے دس برسوں کے دوران انہوں نے جو شاعری کی ہے اس میں ان کے نظریاتی جھکاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی ، ان کا مسلک ہمیشہ کی طرح توانا اور ان کا دل بدستور دردمندی سے عبارت نظر آتا ہے مگر ان کا بات کرنے کا انداز بدل گیا ہے ۔ اب وہ شعری اخفا کو بروئے کار لاکر وسیع تر احساسی منطقوں میں

امکان

مصروفِ سفر ہیں ۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے تو کھلی فضا میں سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں:

آنکھیں ہیں اس کی جھیل ستاروں کے دیس کی
سائے کا ، روشنی کا سفر ساتھ ساتھ ہے

وہ ایک شخص جسے مشعلِ نوا کہئے
وہ ایک شخص جسے نور کا عصا کہئے

افق پر کیسا بادل چھا رہا ہے
اندھیرا روشنی کو کھا رہا ہے
برس جائے تو دکھ کی گرد بیٹھے
جو ٹکڑا ابر کا منڈلا رہا ہے

جل اٹھے ہیں اس کی یادوں کے چراغ
آج اپنا گھر بھی گھر جیسا لگے

کون ہے وہ اور میرا کیا لگے
ظلم بھی جس شخص کا اچھا لگے

اک اجالا سا مرے من میں کسی نام کا ہے
حسن ہر سمت فروزاں سحر و شام کا ہے

سکوتِ لب میں بھی ابلاغ کا ہے وہ عالم
زبان گنگ سی ہے حرف شرمسار سا ہے

اک عمر شمیم آپ کی اس چاہ میں گذری
تپتے ہوئے صحراؤں میں چشمہ کوئی پھوٹے

در آئے جس کا جی چاہے در آئے
• سدا سے دل کا دروازہ کھلا ہے

امکان

مسلسل آب جو میں رہتے رہتے
کنول کا پھول کچھ اکتا گیا ہے
جہاں صدیوں سے ہے پیاسوں کا میلہ
شمیم اس بزم کا شہرہ بڑا ہے
میں اس کو دیکھوں تو جاگے شعورِ خوابیدہ
میں اس کو سوچوں تو پھوٹے افق پہ صبح کی ٹو

آفتاب دامن میں ماہتاب جیبوں میں
میں نے بھر لئے کتنے
تیرگی مٹانے کو زندگی کی راہوں سے
مانگ میں نے دھرتی کی رنگ و نور سے بھر دی
کہکشاں کی چادر سے ڈھک دیا بدن اس کا
چار سُو دھنک پھوٹی

(خواب)

روشنی نکھرتی ہے تیرگی سمٹتی ہے
خامہ خونچکاں اس کا اک جہان معنی ہے
انگلیاں فگار اس کی
خیر و شر کی دنیا میں خیر کی علامت ہیں
انگلیاں فگار اس کی روشنی کی قندیلیں
کرب کی ہیں تصویریں

(صادقین)

امکان

ان اشعار اور شعری ٹکڑوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلم شمیم کس نئے زاویے سے روشنی اور تاریکی کی آویزش کو دیکھنے لگے ہیں۔ مراد یہ کہ انہوں نے روشنی اور تاریکی کی آویزش کو کسی خاص ماحول یا فضا میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے ایک وسیع تر تناظر حتیٰ کہ کائناتی تناظر میں بھی دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ معنیاتی توسیع کا یہی پیرایہ شاعری کی جان بھی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

روشنائی

مسلم شمیم کی شاعری ان کے ترقی پسندانہ رویے کے ناتے حقیقت نگاری کی ایک قابل قدر مثال ہے ۔ ہمارے اس خیال کی صحیح تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ حقیقت نگاری کے بارے میں ذہن کو صاف کر لیا جائے ۔ دراصل خارجی حقیقت کی ہو بہو تصویر کشی کو شاعرانہ حقیقت نگاری سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے اس کے برعکس عمل تخلیق میں شاعر کی وہ فکر شامل ہوتی ہے جو حقیقت کو تمناؤں کی صورت میں پیش کرتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا ادراک اور ہمارا احساس خارجی اشیاء کا وہ عکس ہے جو ہمارے پردۂ شعور پر ابھرتا اور ہماری حسی دنیا کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے ہماری حسی دنیا میں ابھرنے والی صورتیں ہمارے ادراک کے عناصر ترکیبی ہیں یہ عناصر بصری، سماعی اور لمسی نوعیتوں کے ہوتے ہیں ۔ ان میں سے وہ عناصر جن کا تعلق بصارت سے ہے وہ شعری تخلیقات میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور یہی وہ عناصر ہیں جنہیں ہم تمثال سے عبارت کرتے ہیں ۔ یہ تمثالیں شاعر یا کسی بھی تخلیق کار کی اپنی ایجاد ہوتی ہیں لیکن شاعر یا کسی بھی تخلیق کار کی اپنی ایجاد ہونے کے باوجود ان کا تعلق خارجی اشیاء و مناظر یا خارجی حالات و واقعات سے بالکل

اسی طرح کا ہوتا ہے جیسے کسی سوتی کپڑے کا تعلق روئی سے ہوتا ہے اس حقیقت کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر یا کسی بھی تخلیق کار کی ایجاد خارجی دنیا کی تنظیم نو کر کے اسے نئی صورت دینے کا عمل ہے اس نئی صورت کے سلسلہ میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ تمام فنون لطیفہ اپنا مواد خارجی دنیا سے اخذ ضرور کرتے ہیں لیکن بہت بڑی حد تک وہ خارجی دنیا سے الگ بھی اپنی حیثیت رکھتے ہیں جس کا واضح سبب یہ ہے کہ فنون لطیفہ کے نمونوں میں خارجی حقیقت میں فنکاروں کے اپنے احساسات و تصورات بھی شامل ہوتے ہیں جو خارجی حقیقت کی نظر آنے والی صورت کو بدل کر نئے پیکروں میں ڈھالتے ہیں۔

اس پیچیدہ نکتہ کو گوئیٹے نے نہایت عمدگی سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "فطرت (خارجی حقیقت) نتائج سے بے نیاز صرف اپنے طور پر عمل کرتی ہے (یہاں گوئیٹے نے سماجی حقیقت سے الگ رہ کر بات کی ہے) جبکہ فنکار انسان کے طور پر انسانوں کے لئے عمل پیرا ہوتا ہے۔ انسان فطرت کے خزانے سے بہت معمولی حصہ قبول کرتا ہے اور یہ معمولی حصہ وہ ہوتا ہے جو اس کی خواہش کے مطابق ہو اور اسے کیف و انبساط فراہم کر سکے لیکن اس کے برعکس فنکار سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جو کچھ پیش کرے وہ سب کا سب قابل قبول بھی ہو اور کیف و انبساط آور بھی ہو۔ کیف آور ہونے کے ساتھ وہ ذہن کے لئے غذا فراہم کرے اور فکر کی دعوت دے۔ انسانوں کے علم میں اضافہ کرے اور انہیں شریف تر و مہذب تر بنائے۔ فنکار اس معنی میں فطرت کا شکر گزار ہوتا ہے کہ فطرت نے اسے پیدا کیا ہے اور اسے اس لائق بنایا ہے کہ وہ اصل فطرت کے متوازی ایک ایسی فطرت کی تخلیق و تکمیل کرے جو اس کے اپنے احساس و تصورات سے جنم لے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر کسی بھی نابغۂ روزگار یا تخلیقی فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ فطرت کے قوانین کی

مطابقت میں عمل کرے کیونکہ وہ ان قوانین کی روشنی ہی میں فطرت کی دولت اور اپنی صلاحیت سے بیک وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے"۔ گوئیٹے نے اپنے استدلال کو صرف فطرت تک محدود رکھا ہے لیکن خارجی حقیقت میں سماجی حقیقت اور اطراف کے حالات و واقعات بھی شامل ہیں ۔ مسلم شمیم کی حقیقت نگاری اپنی نوعیت میں فطرت کی دولت ، سماجی حقیقت اور اپنی صلاحیت سے بیک وقت فائدہ اٹھانے کی ایک خوشگوار کوشش ہے ۔

خارجی حقیقت شاعرانہ تمثال کا ماخذ ہے اور تمثال کی حیثیت ایک ایسی مخصوص زبان کی ہے جسے انسانوں نے عہدِ عتیق سے اپنا وسیلۂ اظہار یا ذریعۂ ابلاغ بنا رکھا ہے ۔ لفظوں ہی کو لے لیجئے ۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی لفظ کسی متوازی صورت کے بغیر وجود میں نہیں آیا ہے ۔ اسی طرح حقیقی فن بھی اپنے متوازی موضوع سے خود کو محروم نہیں رکھ سکتا یعنی کسی بھی تخلیقی فن میں فن پارے اور معروضی حقیقت کے درمیان رشتہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ مناظر فطرت ہوں یا انسانی احساسات و تصورات یہ سب ہی کسی نہ کسی طرح یا تو خارجی حقیقت کا حصہ یا اس کا عکس ہوتے ہیں ۔ ہر چند احساسات و تصورات اپنی نوعیت میں مادی نہیں ہوتے لیکن مادی دنیا کا عکس ضرور ہوتے ہیں لہذا ہم انہیں مادی دنیا یا خارجی حقیقت سے بالکل الگ نہیں کر سکتے لیکن کچھ جدیدیت پرست کہتے ہیں کہ ان کی فنکارانہ تخلیقات ان کی اپنی ایجاد ہوتی ہیں جو خارجی حقیقت سے بالکل الگ ہوتی ہیں ۔ ان حضرات کا یہ دعویٰ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ سوتی کپڑے کا کوئی تعلق روئی سے نہیں ہوتا ۔ ان کے اس دعویٰ میں دراصل خارجی حقیقت سے ان کی خوفزدگی یا خارجی حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کے لئے ضروری حوصلہ کا فقدان ہے ۔

فنون لطیفہ ایک طرف تو انسان کی ترقی اور اس کی پیش رفت کے سفر میں

اس کے ممدو معاون بن رہے ہیں لیکن دوسری طرف وہ انسانوں کی ترقی کے ساتھ خود بھی آگے بڑھتے رہے ہیں ۔ فنون لطیفہ کے اس دوہرے عمل کے پیش نظر ہم یہ بات بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ فنون لطیفہ انسان کے وقوف و شعور میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور اسے لطف و انبساط سے ہمکنار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ لہذا ہم فنون لطیفہ کو نہ صرف لطف و انبساط اور جمالیاتی قدروں تک محدود کر سکتے ہیں اور نہ اسے صرف افادیت و مقصدیت کا وسیلہ ٹھہرا سکتے ہیں بلکہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فنون لطیفہ یا شعر و ادب کا ایک رخ جمالیاتی اقدار کا حامل ہے اور لطف و انبساط فراہم کرتا ہے جبکہ دوسرا رخ افادی ہے جو نوع انسانی کے وقوف و شعور میں اضافہ کرتا اور اسے شریف تر و مہذب تر بناتا ہے ۔ شعر و ادب کی اس دوہری حیثیت کو تسلیم کرنا اور اپنے تخلیق عمل میں اسے ظاہر کرنا ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا چلن رہا ہے ۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد بھی یہی ہے کہ فنکاروں میں وہ ذوق سلیم پیدا کیا جائے جس سے انکی تخلیقات ایک طرف جمالیاتی قدروں کی حامل ہوں اور انسانوں کو لطف و انبساط فراہم کریں تو دوسری طرف انسانی وقوف و شعور میں اضافہ کر کے زندگی کو مجموعی طور پر نکھارنے ، سنوارنے اور اسے بدلنے کے عمل میں، ممدو معاون ہوں جبکہ ترقی دشمن ادیب یا بزعم خود جدیدیت پرست ادیب و شاعر اطراف میں موجود استحصالی معاشرہ کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی تخلیقات کو خارجی حقیقت یا اطراف کے حالات سے بے تعلق ٹھہراتے ہیں ۔ جدیدیت پرستوں کا یہ رویہ دراصل اسٹیٹس کو (Status Quo) برقرار رکھنے کی ایک سازش ہے فردیت پرستی کا نعرہ اور اجتماعیت دشمنی کا رویہ ان کی اس سازش کا واضح حصہ ہیں ۔ ہمارے ہاں کے اردو ادیب تو اور بھی غضب کرتے ہیں وہ ہیگل کو بغیر سمجھے ہیگل کے تصورِ جمالیات کے ڈھول پیٹنے لگتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ فردیت پرستی اور جدیدیت کی تو پوری تحریک ہی ہیگل کے نظریات کی نفی پر قائم ہے اور ہیگل کے نظریات کی نفی کرنے

والے نیو ہیگلین (Neo-Hegelian) مفکرین دراصل جدیدیت پرستی (Modernity) اور موجودیت (Extentialism) کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں مثلاً ہیگل کے تصورِ تاریخ سے اختلاف کرتے ہوئے "کر کے گار" کا یہ قول کہ انسان کا مسئلہ انسان کی تاریخ نہیں بلکہ خود انسان ہے۔ انسان جو نہ فرد سے زیادہ ہے اور نہ فرد سے کم ... جدیدیت کی اس بنیادی فکر کو تسلیم کرنے والے ہیگل کی جمالیات کو کس طرح ہضم کر سکتے ہیں کیونکہ اس کا تصورِ جمالیات اس کے تصورِ تاریخ سے بالکل الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ یوں بھی جمالیاتی قدروں کے بارے میں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ جمالیاتی اقدار میں نکھار اور سنوار نوعِ انسانی کے شعور میں اضافہ کے ساتھ برابر بڑھتا رہا ہے مثلاً عہدِ قدیم کے بھونڈے زیورات اور آج کل کے نازک و حسین تراش خراش کے زیورات کا فرق نوعِ انسانی کے شعور اور اس کے تصورات کے ارتقائی عمل کا غماز ہے اور نوعِ انسانی کے اس ارتقائی عمل کو ہم تاریخ کے آئینہ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان واضح آثار و شواہد کی موجودگی میں تاریخ اور تاریخیت سے الگ فردیت کے ڈھول پیٹنا بعید از قیاس ہی نہیں بلکہ سازش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

مسلم شمیم مثبت سوچ اور تعمیری رویہ کے حامل شاعر ہیں۔ وہ شاعر کی انفرادیت کے بھی قائل ہیں اور اس انفرادیت کی تشکیل و تعمیر میں تاریخی پس منظر کے کردار کو بھی تسلیم کرتے ہیں مثال کے طور پر ان کے چند اشعار دیکھئے:۔

نجدِ تنہائی ہے اور مصر کے بازار کا خواب
جام جمشید تھا ٹوٹا مرے پندار کا خواب

اس شعر میں آپ کو ہماری شعری روایت میں بکثرت ملنے والی تین تلمیحات ملتی ہیں یعنی نجد، مصر کا بازار اور جامِ جم لیکن شعری روایت کے برعکس یہاں ان تلمیحات

کے تلازمات کو بالکل بھی نہیں برتا گیا ہے۔ روائتی اسلوب کے ساتھ یوسف، عزیز مصر یا زلیخا اور جامِ جم کے ساتھ ایران کے بادشاہ جمشید کی طرف اشارہ ضروری تھا لیکن مسلم شمیم نے یہ تینوں تلمیحات بغیر تلازمات کے استعمال کی ہیں جس سے عہدِ حاضر میں پائے جانے والے انتشار، افراتفری اور بحرانی دور کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ روائتی معاشرہ جمی جمائی اور مسلمہ اقدار کے سائے تلے زندگی گذار رہا تھا لیکن صنعتی انقلاب کے بعد مسلمہ اقدار کی گرفت کمزور پڑ گئی اور نئے حالات اور نئے انسانی رشتوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جس کی وجہ سے دنیا کے تمام معاشرے کسی نہ کسی حد تک شکست و ریخت اور بحران کا شکار ہیں۔ اس بحران اور انتشار میں جمے جمائے تلازمات بالکل مصنوعی بات ہوگی لہذا تلازمات سے آزادی حاصل کر کے شاعر نے اپنی انفرادیت اور اپنے عنصر کی ماہیئت کو واضح کر دیا ہے جبکہ ان تلمیحات کو قبول کر کے تاریخ اور شعری روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور یہ سب کچھ انہوں نے شعوری طور پر نہیں کیا ہے بلکہ یہ ان کی مثبت فکر اور تعمیری رویہ کا نتیجہ ہے جو غیر ارادی طور پر ان کے متخیلہ نے انجام دیا ہے.... یا ان کا یہ شعر

حیا بکھرتی رہی اس کے عارض و لب پر
مذاکرات بڑے چشمِ مہرباں سے رہے

یہاں لفظ "مذاکرات" ہماری شعری روایت سے بالکل الگ عہدِ حاضر کے معمولات کا حصہ ہے۔ روائتی معاشرہ میں بادشاہ کا حکم چلتا تھا بادشاہ سے انصاف کی بھیک مانگی جاتی یا اس سے رحم کی اپیل کی جاتی تھی بادشاہ سے مذاکرات کا تصور ہی نہیں تھا۔ بادشاہ اپنے وزیروں سے مشورہ ضرور کر لیتا تھا لیکن یہ مشورہ خود اس کی اپنی مرضی سے ہوتا تھا اور اس مشورہ کو قبول کرنا یا رد کرنا بادشاہ کا حق ہوتا تھا جب کہ عہدِ حاضر میں مذاکرات جمہوری عمل کو استوار رکھنے کا ایک اہم عنصر ہیں۔ غزل کے شعر

ہیں لفظ مذاکرات جدید اندازِ فکر کا ترجمان ہے جب کے "حیا کا عارض و لب پر بکھرنا" ہماری شعری روایت میں محبوب کے اعترافِ محبت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ یہاں اس روایتی تصور کو فضول کہا گیا ہے لیکن ساتھ ہی جدید اندازِ فکر کو بھی شامل کر دیا گیا ہے جو مسلم شمیم کی صحتمند سوچ کی ایک روشن دلیل ہے اور جدت و ندرت اور روایت کے امتزاج کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ خالص جدید احساس کا ترجمان ایک شعر ملاحظہ ہو

زہر کے پودے اگے ہیں خوف کے سائے تلے
فصل گل اس بار بھی وقف تماشا کر گئی

خوف، دہشت اور احساس اجنبیت صنعتی معاشرہ کے انتشار کے عناصر ترکیبی ہیں جن کا اظہار جدیدیت پرست طرح طرح سے کرتے رہتے ہیں لیکن مسلم شمیم نے یہاں ان عناصر کا اظہار جدیدیت پرستوں کی حریفانہ روش سے الگ اپنے طور سے کیا ہے۔ انہوں نے معاشرے میں بڑھتی ہوئی خوف کی فضاء کے آگے ہتھیار ڈالنے کی جگہ خود کو اس فضاء کا تماشا کرنے کے لئے وقف کر دینے کے بات کی ہے جس سے ایک بات تو یہ ابھر کر آتی ہے کے شاعر خود اس خوف کا شکار نہیں ہے بلکہ اس کا تماشائی ہے یعنی اسے دیکھ رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس نے خود کو اس فضاء پر غور و فکر کے لئے وقف کر دیا ہے تاکہ اس پر قابو پانے کی راہ ہموار کر سکے۔ یہ سب باتیں واضح طور پر کسی وعظ، تلقین یا تبلیغ کے طور پر نہیں کہی گئی ہیں بلکہ نہایت دلآویز و دلنشین اشاروں میں مفہوم ادا کیا گیا ہے اور شاید اسی انداز کے اظہار کو شاعرانہ اظہار کہا جاتا ہے۔ ہم اس انداز کو روایت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اب ان چند اشعار کی وضاحت کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے کچھ اشعار بغیر کسی وضاحت کے پیش کر دیں تاکہ قارئین اپنے طور پر محسوس کریں کے مسلم شمیم جدیدیت و

روایت کو یکجا کرنے کے ساتھ مصرعوں کے آہنگ سے کتنا کام لیتے ہیں اور وہ الفاظ کے معنی سے قطع نظر صرف صوت و آہنگ سے اپنے احساس کی عکاسی کا کیسا سلیقہ رکھتے ہیں

اک کہکشاں ابھرتی رہی حرف و صوت کی
موتی تخیلات کے وہ رولتے رہے
کیا سحر اس نے کردیا ہنگام گفتگو
پہروں ہم اپنے آپ سے کچھ بولتے رہے

ہجر کا موسم جب آئے وصل کی خوشبو کھلے
فاصلوں کے درمیان قربت کا اندازہ ہوا

جب بھی وہ سائبان توجہ سمیٹ لے
اپنا وجود دشتِ بلا کی طرح لگے
ہے چھاؤں اس کا دھیان کڑی دھوپ میں شمیم
تپتے ہوئے بدن پہ ردا کی طرح لگے

کس درجہ تیز دھوپ ہے سچائیوں کی آج
اہل یقیں بھی سایہ۔ نخل گماں میں ہیں

دیئے بجے رہیں پلکوں پہ دل سلگتا رہے
وہ آئے یا کہ نہ آئے یہ التزام رہے

اک شخص اٹھ کے کوئے ملامت سے گھر گیا
اس سانحہ کو ایک زمانہ گذر گیا

امکان

دل کا غرور ان کی توجہ کا عکس تھا
بارش تھمی تو آپ ہی دریا اتر گیا

نخلِ جاں پھر جھلس نہ جائے کہیں
دھوپ احساس کی کڑی ہے بہت
درد کا چاند ہی نکل آئے
دل کے صحرا میں تیرگی ہے بہت

وہ آرہے ہیں مداوائے دردِ دل کرنے
ندامتوں کے جلو میں نظر جھکائے ہوئے

جنگل کو اپنے شہر کی تقدیر جانیے
اب روشنی کی بھیک اندھیروں سے مانگیے
اندھے کنوؤں سے کیجئے سیراب کشتِ دل
ریگِ رواں پہ پیار کے پودے اگائیے

دھیان اس کا تھا اک چبھن کی طرح
دل میں گویا وہ کوئی تیر سا تھا

انتخاب خاصہ طویل ہو گیا ہے لیکن مزید انتخاب کی گنجائش اب بھی باقی ہے۔ بہرحال اس نامکمل انتخاب پر بھی ایک نظر ڈال کر دیکھیں کہ مسلم شمیم نے اپنے احساس کو کس خوش اسلوبی سے دوسروں تک منتقل کیا ہے۔ احساس کا دوسروں تک منتقل کرنا سخت دشوار کام ہے کیونکہ احساس کی نہ کوئی صورت ہوتی ہے اور نہ اس کی

ادائیگی کے لئے کوئی متعین الفاظ ہوتے ہیں لہٰذا شاعر کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا کہ وہ کچھ استعاروں ، تمثالوں اور تراکیب کے ساتھ مصرعوں کے آہنگ سے ایسی فضا ابھار دے جو شاعر کے احساس سے ملتے جلتے تاثرات پیدا کر سکے مسلم شمیم نے ایسی ہی فضا ابھارنے کی کوشش کی ہے مثلاً مندرجہ بالا اشعار میں ان تراکیب اور تمثالوں کو دیکھئے "حرف وصوت کی کہکشاں" ، "تخیلات کے موتی" ، وصل کی خوشبو" ، "سائبان توجہ" ، "سچائیوں کی تیز دھوپ" ، "نخل جاں کا جھلسنا" ، "احساس کی کڑی دھوپ" ، "درد کا چاند" ، "اندھیروں سے روشنی کی بھیک مانگنا" ، "اندھے کنوؤں سے کشتِ دل سیراب کرنا" ، "ریگِ رواں پہ پیار کے پودے اگانا" .. یہ تمام تراکیب ایک طرف تو عام سیاسی و معاشرتی کوائف سے پیدا ہونے والے احساسات کے واضح اشاریے ہیں ، دوسری طرف یہ تراکیب اپنے طور پر ایسی تمثالیں نظروں کے سامنے ابھارتی ہیں جو ایسی فضا پیدا کر سکیں جس کے تاثرات شاعر کے احساس تک رسائی کو ممکن بنا دیں ۔ ان خصوصیات کے علاوہ مصرعوں کا آہنگ اپنی جگہ مفہوم کو سمجھنے میں مدد دیتا محسوس ہوتا ہے ۔ ہمارے خیال میں اچھی اور سچی شاعری کے شاید یہی لوازمات ہیں اور مسلم شمیم نے اپنی شاعری میں ان لوازمات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے ۔

غزلوں کے علاوہ ان کی نظمیں بھی غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے تانے بانے سے کچھ طرح بنی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہے ۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو ایک کل بنا دینا فکر کی کلیت اور صحتمند رویہ کی بین شہادت ہے ۔ مثال کے طور پر ان کی مختصر نظم "مکالمہ" کو دیکھئے جس میں "آئینہ" اور "چہرہ" دو استعارے استعمال کئے گئے ہیں اور ان استعاروں میں عام سیاسی و معاشرتی حالات کے ساتھ شاعر نے اپنے جذبے اور محبوب کے ردِ عمل کو بھی اجاگر کیا ہے ۔ یہ دوہری

معنویت دراصل مذکورہ استعاروں کے اپنے پھیلاؤ میں موجود ہے ۔ ظاہر ہے کہ "آئینہ" اور "چہرہ" کے استعارے اجتماعی صورتِ حال پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں اور ان کا اطلاق شاعر کے خالص عشقیہ معاملات پر بھی ہو سکتا ہے یعنی معنیٰ کی یہ دونوں تہیں اور احساس کی یہ دونوں صورتیں بیک وقت موجود رہتی ہیں ۔ یوں بھی شاعری دو اور دو چار کی طرح کبھی یک رخی نہیں ہوتی ، ہماری روایتی شاعری میں مجاز و حقیقت دونوں رخوں کا ایک ہی وقت اور ایک ہی شعر میں احاطہ کر لینا اچھے شاعروں کا چلن رہا ہے ۔

آئینے اور چہرے کا سن کر مکالمہ
منظر کوئی بھی منظرِ حیرت نہیں رہا
ہونٹوں پہ کوئی حرفِ شکایت نہیں رہا
دل کو خیال داغ ندامت نہیں رہا
شوقِ طوافِ کوئے ملامت نہیں رہا
کربِ دروں کا شور اب ان مرحلوں میں ہے
سڑکوں کا شور بارِ سماعت نہیں رہا

(مکالمہ)

یوں بھی شاعری کبھی خطِ مستقیم میں نہیں ہوتی ۔ اس میں مناسب موڑ اور تہوں کا ہونا ضروری ہے ۔ یہ مناسب موڑ اور تہیں شاعرانہ ابہام و ایمائیت اور لفظوں کی ہمہ جہت معنیٰ آفرینی سے پیدا کی جاتی ہیں لیکن ہمہ جہت معنیٰ آفرینی کا عمل اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک شاعر کی اپنی شخصیت پوری زندگی کی کلیت سے آراستہ نہ ہو ۔ مسلم شمیم کی شخصیت کی کلیت کا اندازہ شاید اس مختصر نظم سے بہ آسانی ہو سکے ۔ نظم کا عنوان ہے "امکان"

امکان

صرصر چلے کہ بادِ صبا اک سرور ہے
منظر کوئی ہو جوشِ نمو کا وفور ہے
کانٹے اگیں کہ پھول کھلیں شاخ پر شمیم
یہ موت کی شکست کا عنوان ہی تو ہے
زخموں کی فصل زیست کا امکان ہی تو ہے

ان پانچ مصرعوں میں زندگی کی کلیت کو جس جامعیت و اختصار کے ساتھ واضح کیا گیا ہے یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک شاعر خود بھی شخصیت کی کلیت و سالمیت کا حامل نہ ہو۔ ان کی ایک اور مختصر نظم "محاسبہ" ہے۔ اس نظم میں بھی زندگی کی کلیت نوعِ انسانی کے لہو سے جلنے والے چراغوں کی روشنی میں ابھرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔

ارضِ چمن پہ کب سے اندھیروں کا راج ہے
ٹوٹا کبھی تو لمحے کو، شب کا محاصرہ
ہوتا رہا ہے نورِ سحر کا محاسبہ
ہر کربلا کے بعد پھر اک اور کربلا
خونِ صبا، کہ خونِ تمنا، کہ خونِ جاں
جب بھی یہاں چراغ جلا خون سے جلا

(محاسبہ)

زندگی کی کلیت اور اس کے تسلسل سے متعلق ایک نظم اور ملاحظہ ہو۔ عنوان ہے "داغ پس داغ"

امکان

شاخ ، سرسبز جو کاٹی گئی کس باغ کی تھی
کس گلستاں کے شجر سوکھ رہے ہیں دیکھو
برہنہ پیڑ قطاروں میں کھڑے ہیں دیکھو
کوئی سایہ نہیں ، سایہ ہے تو دکھ کا سایہ
راہ میں مسلے ہوئے پھول پڑے ہیں دیکھو
جابجا زخم زمینوں پہ اگے ہیں دیکھو
داغ ہی داغ جبینوں پہ سجے ہیں دیکھو
خوں بہا کس سے طلب کیجیے اپنے خوں کا
شک کا اظہار کریں کس پر عدو کس کو کہیں
کس پر الزام دھریں کس پہ اٹھائیں انگلی
آستیں اپنی ، لہو اپنا ہے ، خنجر اپنا
کس کے ہاتھوں پہ نشاں قتل کا اپنے ڈھونڈیں
نیند آجائے تو یارو نئے سپنے ڈھونڈیں

یہ اور ایسی نظمیں مسلم شمیم کی شخصیت کی سالمیت، فکر کی پختگی اور صحتمند رویے کی داخلی شہادتیں ہیں ۔ وہ سماجی حقیقت نگاری کے دبستاں سے پورے وقوف و شعور کے ساتھ وابستہ ہیں ۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاعری میں خارجی حقیقت کو تخلیقی سطح پر جب پیش کیا جاتا ہے تو اس فنکار کا اپنا احساس شامل ہو کر اسے ایک نئی صورت دیتا ہے ۔ یہ نئی صورت عام نظروں سے اوجھل ہوتی ہے لیکن جب فنکار عام نظروں سے اوجھل حقیقت کو ابھارتا ہے تو قارئین حیرت و انبساط کے ساتھ کہہ اٹھتے ہیں "ارے یہ بالکل سامنے کی بات تمہیں نظر نہیں آرہی تھی" .... حیرت و

امکان

انبساط کی ایسی کیفیت کا پیدا کرنا شاعری ہے اور مسلم شمیم اس کیفیت کو ابھارنے میں مسلسل منہمک ہیں۔ نظم "درد کا پڑاؤ" اسی زمرہ میں آتی ہے۔

جہان کرب سمیٹے میں اپنی آنکھوں میں
مشاہدہ جو فصیل نظر کا اس کی کروں
مشاہدات فصیل نظر میں کھوجاؤں
گھنیری چھاؤں میں پلکوں کی اس کی سو جاؤں
پس فصیل نظر میں جو جھانکنا چاہوں
قطارِ قوس قزح درمیان آجائے
حواس خمسہ پہ سحر جمال چھاجائے
پس فصیل نظر کیا ہے کیا پتہ مجھ کو
پڑاؤ قافلہ۔ درد کا وہاں بھی نہ ہو
شکست و ریخت سے دوچار اک جہاں ہی نہ ہو

احمد ہمدانی

حرفِ آشنا

شعری مجموعہ شاعر کی ذاتی و سماجی شخصیت کی دستاویز ہوتی ہے ۔ جدید نفسیات کی تجزیاتی ٹیکنک کا اطلاق کیجئے تو متن کے اندر سے لکھنے والے کے چور پکڑ میں آجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں علوم سماجیات ، سماجی امور ، ثقافت اور تاریخ و بشریات نے شعر و ادب سے استفادے کی طرح ڈالی ہے ۔ ستر (۷۰) کی دہائی میں اقوامِ متحدہ کی تنظیم نے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ امورِ سماجیات کے زیرِ اہتمام ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا تھا ۔ اس ورکشاپ میں شریک اہل نظر نے اردو کے تخلیقی ادب سے شاعروں اور افسانہ نگاروں کے نام منتخب کئے اور ان کی نظموں اور افسانوں کے تجزیاتی مطالعے کی مدد سے سماجیاتی خاکے مرتب کئے ۔ ورکشاپ کا یہ تجربہ بہت مفید ثابت ہوا مگر کراچی یونیورسٹی سے حکومتِ پاکستان کو بھیجی جانے والی تجاویز وزارتِ تعلیم نے فضول سمجھ کر رد کردیں ۔ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں نے اقوامِ متحدہ کے اس تجربے سے فائدہ اٹھایا چنانچہ شاعری اور ادب کو سماجی امور ، سماجیات ، ثقافت اور تاریخ و بشریات کے نصابات میں جگہ مل گئی ۔ بھولی بسری یہ کہانی اس لمحے یاد آئی جب مسلم شمیم کے مجوزہ شعری مجموعے کا

امکان

متن زیرِ نظر آیا۔ ان کی پوری شاعری کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ اس کی مدد سے ایک دور کے سماجیاتی خاکے مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ ان اشعار کے پس منظر سے پرآشوب عہد کے خد و خال دکھائی دیتے ہیں جو کہ نہ صرف جاری ہے بلکہ آگے کی طرف بڑھتا جارہا ہے ایسے تمام ممالک جو ایک دہائی پہلے امن و خوش حالی اور انسانی اقدار کا استعارہ سمجھے جاتے تھے اس آشوب کے سیلاب میں بہہ گئے۔

در پیش کارواں کو لہو کی ڈگر ہے آج
رستے میں زندگی کے عجب رہگذر ہے آج
پھر کربلا ہے معرکہ خیر و شر سے آج
پھر مہر نیم روز کا نیزے پہ سر ہے آج
پھر عدل کا سفیر ہوا قتل راہ میں
پھر ظلم سربلند ہے سب کی نگاہ میں

سنہ ۱۹۹۲ء

من وتو، مساوات و عدم مساوات اور انسان دوستی و انسان دشمنی کا فرق اب مٹ چکا ہے پوری دنیا پر صرف ایک ہی موسم چھایا ہوا ہے یعنی عدم مساوات اور انسان دشمنی کا۔ اس حوالے سے نظم "حرفِ سپاس" عالمی صورتِ حال کا منظر دکھاتی ہے جہاں خود شاعر محسوس کرتا ہے کہ

میں دم بہ خود کھڑا ہوں کسی قتل گاہ میں

یہاں شاعر دوسری انتہا پر ہے جو پہلی انتہا کی ضد ہے۔ دورِ اول کی شاعری اہل نظر اور قارئین کو اس سمت کے سنگِ میل تک لاتی ہے جہاں نجات (SALVATION) کا راستہ نظر آتا ہے۔

امکان

محفل میں لے کے نظر دل و جاں چلو چلیں
منزل بہت قریب ہے اس رہ گذر کے بعد

۱۹۴۱ء

ان دونوں انتہاؤں کا موازنہ کرنے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی کی سرحد پر کھڑی ہوئی پوری دنیا نجات کی سمت کی طرف جاتے ہوئے راستہ بھٹک گئی۔ تاریخ میں ایسے موڑ پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ ایسے مرحلوں پر خضر راہ کا کردار کون ادا کرتا ہے سوائے ترقی پسند شعور۔

شعری یا ادبی مجموعے کو متعارف کرانے والے بھی عموماً تجزیاتی تعبیر و تشریح بلکہ آج کی اصطلاح میں کسی حد تک ساخت شکنی (DE CONSTRUCTION) ہی پر انحصار کرتے ہیں۔ موجودہ صدی کی براعظمی (CONTINENTAL) تنقیدی تھیوری کے تقاضے جسے براعظمی کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ اس کے گہرے اثرات دنیا کی اکثر زبانوں کے شعر و ادب نے قبول کئے ہیں اس قسم کی ساخت شکنی سے پورے ہو بھی نہیں سکتے۔ اسے تنقید کہنا بھی صحیح نہیں ہے گو کہ اردو میں اب تنقید کے یہی معنیٰ لئے جا رہے ہیں۔ اس طرح ہم شعر و ادب کے ذوق و شوق رکھنے والے سنجیدہ قارئین کی صلاحیت کو نظر انداز کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قارئین تو وہی ہوتے ہیں جو شعر و ادب کے طلسم میں مبتلا (INVOLVE) ہوں۔ وہ شاعر کے عہد میں رہتے ہوئے ایسے تناؤ، تجربوں اور وارداتوں سے گذرتے ہیں جس کا انعکاس شعری مجموعے میں ہوتا ہے اور اس کیفیت سے سرشار کرتا ہے جس کے لئے غالب نے کہا ہے کہ ؏

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مغرب کے تنقیدی شعبوں میں " قاری اساس " (READERS

امکان

(RESPONSE تنقید شعر و ادب میں قارئین کے ناقدانہ کردار کو بھی مرکز توجہ بناتی ہے اور ساختیات کے اس دعوے کو توڑتی ہے کہ نہ تو قاری ہے اور نہ تخلیق کار بقول بازی لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر و ادب میں تخلیق کار تخلیق اور قارئین برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ نقاد بھی تو ایک قاری ہی ہوتا ہے فرق اگر کوئی ہے تو صرف مرحلوں (GRADINGS) اور سطحوں کا ہے۔

مسلم شمیم پر لکھنا ایک طرح کی ذمے داری بھی ہے کیونکہ ان کے تخلیقی سفر کی اٹھتی ہوئی باڑھ اور کاٹ کا زمانہ وہ تھا جب ہم ایک دوسرے سے کسی فاصلے پر نہیں تھے۔ اجتماعی دکھ درد سماج کو بدلا ہوا دیکھنے کی شدید خواہش اور کربِ آگہی ہمارے درمیان ذہنی مناسبت کا ذریعہ تھے۔ تبدیلی کی اس خواہش کا عرصہ بھی خاصا طویل رہا یہ اور بات ہے کہ ع مرض بڑھتا ہی رہا جوں جوں دوا کرتے گئے۔ یہ زمانہ شہر لاڑکانہ میں قیام کا تھا جو سندھ کی تاریخ و ثقافت کا گہوارہ ہے۔ ہم نے آمریت کو اس کی ہر صورت میں دیکھا اور محسوس کیا تھا اور مسلم شمیم نے کہا کہ ؎

چراغاں بھی کریں گے قاتلوں کے خوں سے مقتل میں
ابھی تو ظلم کا سورج ہے سر پر، شام ہو جائے

ان کے اس شعری مجموعے میں بھی ایسی چند غزلیں اور نظمیں ہیں جن کے لمحات، آمد اور بعد میں نظرثانی ہماری رفاقت کی گواہی دیتی ہیں بعض غزلوں میں تو وہ وارداتیں بھی سمٹ آئی ہیں جو باہم گپ شپ یعنی کچھ اپنی کہیے کچھ میری سنیئے کے نتیجے میں وارد ہوئیں۔

مسکراتی ہوئی آنکھیں وہ سلگتے ہوئے لب
ایسے ماحول میں مشکل ہے کوئی زندہ رہے
ذکرِ فردوسِ نگاراں ہی رہے آج کی شب
گفتگوئے دل پر خوں کبھی آشدہ رہے

امکان

یوں مضطرب رہا ہوں تیری اک نظر کے بعد
جیسے کہ بادہ نوش مئے مختصر کے بعد
شاید کہ اعتبارِ وفا آگیا مجھے
ہیں وہ بہت اداس میری چشمِ تر کے بعد

روایت پسند اور زندگی کے رمز سے بے خبر اسے تقاضائے عمر ہی کہیں گے کیونکہ وہ اس حقیقت کا ادراک کر بھی نہیں سکتے۔ کہ عشق انسان کی ضرورت ہے۔ ان غزلوں میں جو زیادہ قریبی دور کی تخلیق ہیں شوخی، رمزیت، حسن کاری اور معاملاتِ دل کا رنگ اور زیادہ چوکھا ہے۔

موضوعِ حسنِ شعر پہ وہ بولتے رہے
کانوں میں دیر تک میرے رس گھولتے رہے

سنہ ۱۹۹۲ء

سردمہری اس کی کچھ لمحوں کی کیا کیا کر گئی
چاندنی میں دھوپ کا احساس پیدا کر گئی

سنہ ۱۹۸۵ء

اس جانِ شعر و فن سے شمیم آج گفتگو
آغاز کیجئے غزلِ خوشگوار سے
حسنِ اک شخص میں اسیر سا تھا
عشق کرنا تو ناگزیر سا تھا

سنہ ۱۹۹۳ء

لبوں پہ نام مچلتا ہے کس پری وش کا
شمیم کیسا رگ و پئے میں یہ خمار سا ہے

سنہ ۱۹۹۳ء

لاڑکانہ کا دور جو کم و بیش سنہ ۱۹۶۰ء سے شروع ہوا تھا سنہ ۱۹۷۳ء پر تمام ہوا
یہ شہر کبھی ہمارے لئے مثل شہر نگاراں تھا یہاں ہم نے حلقۂ یاراں کے تعاون سے
انجمن آرائیوں، تنظیم سازی اور مشاعرہ بازی کی روایت کو فروغ دیا۔ لاڑکانہ جیسے
شہر میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی جس کے زیر اہتمام ایک لائبریری بھی بنائی
گئی تھی اس کے بعد حلقۂ ادب بنایا گیا جس کے تحت یوم نیاز فتح پوری کی وہ
خصوصی تقریب منعقد ہوئی جس میں شرکت کے لئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی سے
پہلی بار لاڑکانہ آئے۔ سنہ ۱۹۶۵ء کے بعد انتخابات میں ایوب خاں نے مادرِ ملت
محترمہ فاطمہ جناح کی جیت کو ہار میں بدل دیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔
سیاست دانوں کے ایوانوں میں بھی کہیں جنبش کا نام و نشان نہیں تھا۔ سیاسی سطح
پر مزاحمت کا جو دباؤ اندر ہی اندر موجود تھا اسے تحریک دینے کا کارنامہ بھی سب سے
پہلے حلقۂ ادب لاڑکانہ نے مشہورِ زمانہ کل پاکستان بین اللسانی مشاعرہ منعقد کر کے
انجام دیا، حبیب جالب جن کی قبولیت ملک کے عوام میں ان دنوں بام عروج پر تھی
پہلی بار اس مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے تو سارا شہر امڈ پڑا۔ جالب اور خالد
علیگ مشاعرے کی پوری رات لوٹ لے گئے۔ اس مشاعرے میں مسلم شمیم نے یہ
غزل سنائی تھی:۔

کیفیتِ شکستِ دلِ زار کچھ کہو
سونی ہے آج انجمن یار کچھ کہو

اے اہل درد جذب کرے گی زمین دل
کب تک یہ خون دیدۂ بیدار کچھ کہو

حرص و ہوس کی جیت ہوئی زندگی کی ہار
پھر نفرتوں کا گرم ہے بازار کچھ کہو

تاریکیوں میں ڈوب گیا روشنی کا شہر
ناپید پھر ہیں صبح کے آثار کچھ کہو

اس غزل کا سن تخلیق سنہ ۱۹۶۷ء ہے۔

آمریت کے خلاف سیاسی مزاحمت کی تحریک کو فعال بنانے میں اس بین اللسانی مشاعرے نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ فیض بھی اس محفل کی صدارت کے لئے پہلی بار لاڑکانہ تشریف لائے تھے۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد سماجی و سیاسی صورتِ حال میں ہلچل رونما ہوئی اور وہ موسم جو لاڑکانہ کی پہچان تھا ڈھلنے لگا۔ وقت کے تیور بدل رہے تھے۔ ایک جی جمائی ثقافتی دنیا مٹ رہی تھی حتیٰ کہ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ وہ سرزمین، ماحول اور سنگی ساتھی جن سے انس ہو چلا تھا چھوٹ گئے۔ مقامی بزرگوں نے جن بچوں کو اپنی گودوں میں کھلایا تھا جوان تو ہو گئے مگر ان بھاگتے ہوئے جوانوں کو وہ روک نہ سکے۔ مقامی عوام کی اکثریت اور روشن خیال و ترقی پسند دانشور سکتے میں رہ گئے کہ یہ سب کچھ ہوا کیا۔ وہ لوگ جو ساتھ رہنا چاہتے تھے ایک دوسرے کی زبانوں اور ثقافتوں کے رکھوالے بن گئے تھے اور مسلم شمیم بھی کہے بغیر نہ رہ سکے:-

سندھ آغازِ تمدن کا درخشاں مہتاب
سندھ تاریخ تمدن کی سنہری سی کتاب
سندھ کی عظمتِ دیرینہ پہ حیراں ہے نگاہ
سندھ کی بیکسیء حال پہ گریاں ہے نگاہ

ایک دوسرے سے دور جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس صورتِ حال کی محرک قوت جواں سال نسل کی قوم پرستی تھی جو ترقی پسند قوتوں کے ہاتھوں سے نکل کر فیوڈل سیاسی قوت کا مہرہ بن گئی تھی۔ عراق پر امریکہ کی یلغار کے ساتھ جب نیو ورلڈ

آرڈر کا سورج ابھرا تو قوم پرستی اور فرقہ واریت کے چہروں پر چڑھی نقابیں اتر گئیں۔
؎ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔

مسلم شمیم کی شاعری کا پہلا مرحلہ سنہ ۱۹۷۳ء پر تمام ہو گیا اور اب ایک اور دور کراچی سے شروع ہوا۔ یہ کیسا عجیب شہر تھا کہ روزانہ صبح و شام ملنے والے ہم دس سال تک ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔ دس سال بعد تجدید رسم ملاقات اس وقت ہوئی جب پل کے نیچے سے بہت پانی گذر چکا تھا اور معاملہ کچھ اس طرح تھا۔

وہ میری دیوانگی کی آخری تصویر تھی
آئینہ بھی روبرو تھا ہاتھ میں پتھر بھی تھا
حزیں صدیقی

بہر حال نقطۂ نظر کے درمیان مکمل ہم آہنگی کا مسئلہ بھی اضافی ہی ہوتا ہے نہ کہ مطلق جزوی اختلاف کا کسی مرحلے پر پیدا ہونا یا نہ ہونا آزادی۔ فکر و نظر کو اعتبار عطا کرتے ہیں۔ مسلم شمیم کا شمار ہر صورت میں معتبر، اچھے اور منجھے ہوئے شاعروں میں ہونا چاہیئے کیونکہ ان کا یہ مجموعی سرمایہ ترقی پسند ادبی فکر کی واضح نشان دہی کرتا ہے۔ یہی وہ ادبی فکر ہے جو اس وقت بھی مستند و آفاقی منصب پر فائز ہے اور جسے جمہور کی توجہ بھی حاصل ہے حالانکہ شعر و ادب کی قلمرو میں اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں رائج ہیں۔ نظریات اور معیاروں کا ہجوم ہے مگر کیا ان میں کوئی بھی جدلیاتی منطق، تجربوں اور تاریخیت کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں؟ یقیناً نہیں اور اس کے نتیجے میں شکست کا احساس ہی عموماً شدت پسندی، جارحیت، ضد اور اختلاف میں نفرت کے رنگ بھرتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی بات منوانے کا اور کوئی ذریعہ ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ جہاں تک مسئلہ لفظ "ماڈرن" کا ہے جسے اردو کے اہل نظر نقادوں نے مختلف معنوں سے تعبیر کیا ہے تو ترقی پسند اصطلاح بجائے خود "ماڈرن" ہی کے

مترادف ہے ۔ ہر عہد کی ترقی پسندیت ہی اس عہد کا ماڈرن رویہ ہوتی ہے ۔ "ماڈرن" سے آگے بڑھ کر سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو میں ایک اور اصطلاح "موڈرنزم" کا رواج ہوا ان متضاد اصطلاحات کی ہوا باندھنے کا سبب شعر و ادب کے سماجی و سیاسی اور نظریاتی و ثقافتی کردار کی نفی کے لئے فضاء ہموار کرنا ہے تا کہ علوم و افکار اور ادبیات و شعریات سے اجتماع کو کاٹ کر اسے نجی (PRIVATE) بنایا جاسکے ۔ ترقی پسند فکر پر خارجیت اور اجتماعیت کے الزامات جو عائد کئے گئے قطعی یک طرفہ ہیں ۔ وہ نہ تو نجی اجتماعیت کی ہمنوا ہے اور نہ خارجیت کی بلکہ انفرادیت و داخلیت کو خارجی و اجتماعیت میں مدغم کر کے ایک فعال و صحت بخش اکائی پر منتج ہوتی ہے ۔ مسلم شمیم کی شاعری اس اصول پر پوری اترتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کی ترقی پسندیت نے اپنے بعد آنے والے عہد کو کروٹ دی ۔ سرائلزم ، دادائیت ، کیوبزم ، وجودیت ، خودکلامی ، تجریدیت ، داخلیت ، جدیدیت ، تحلیل نفسی ، ایمجزم ، جدید علامت نگاری ، ہئیت پرستی ، فنامنالزم ، ساختیات اور اب بعد از جدیدیت وغیرہ اپنی اپنی باری پوری کر کے سدھار چکی ہیں جبکہ ترقی پسند فکر جو زمانی و مکانی اضافیت کے نظام سے برآمد ہوتی ہے ہمیشہ ہی رہی اور اب بھی ہے ۔ موجودہ صورتِ حال میں جب کرۂ ارض پر عوام کی حکمرانی کی تاریخ کو اینگلو امریکی تاجروں ، صنعت کاروں اور بینکروں نے جن کے لئے نجی ملکیت و کاروبار عقیدے کے مترادف ہے اور سرمایہ دارانہ جمہوریت اس کی دفاعی چھتری ہے زد و کوب کر کے پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا ہے ان ہی ملکوں کے دانشوروں ، اساتذہ اور باشعور شہریوں کا طبقہ شعر و ادب کے نظریاتی و سماجی اور سیاسی و تاریخی کردار کے دفاع میں سرگرم کار ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ جدید بین الاقوامی شعور و آگہی کا مطالعہ بہت واجبی سا ہے یا اگر ہے تو اس کے اظہار و اعتراف سے دیدہ و دانستہ گریز برتا جاتا ہے اس حقیقت سے بحث کرتے ہوئے ایم اینیٹ جیمس (M. ANNETTE JAMES) نے نومبر سنہ ۱۹۹۱ء میں لکھا ہے کہ

امکان

"حکمراں کلچر کے زیرِ سایہ تخلیق پانے والا ادب اس سیاسی قوت کی زبان بولتا ہے جو عوام کی اکثریت کو بے سروپا اور جھوٹی اطلاعات کے طلسم میں جکڑ لیتا ہے۔ اگر حکمراں قوتیں ایسا نہ کریں تو عوام ان محرکات و وجوہات سے باخبر ہوتے جائیں گے جن کی بناء پر محکومی و محرومی ان کا مقدر بنتی ہے۔ اس قسم کی باخبری اجتماعی وجود اور جملہ مفادات کے تحفظ کی جدوجہد کو جنم دیتی ہے جو حکمراں قوتیں کسی بھی صورت میں گوارا کر ہی نہیں سکتی ہیں"۔

(فنیٹیسیز اینڈ ماسٹر ریس۔ کامن کریج پریس ماین سنہ ۱۹۹۲ء)

وارڈ چرچل (WARD CHURCHILL) نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ

باہر کی دنیا والے کیا جانیں کہ امریکی سامراجیت نے اپنی جڑیں اپنے ہی وطن کے چپے چپے میں پھیلا رکھی ہیں۔ (فنتسریز اینڈ ماسٹر ریس)

دنیا بھر کی بہترین شاعری کے پس منظر میں سامراج کے خلاف مزاحمت کا احساس ملتا ہے اور اردو میں بھی اس توانا روایت کی پوری تاریخ موجود ہے۔ اٹھارویں صدی تک اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں تصوف کے شعری دبستان کا بھی یہی مسلک رہا تھا۔ مسلم شمیم کی شاعری اپنی سمت کے اعتبار سے سامراج شکن ہے۔ دورِ آمریت کے سخت گیر ماحول کے دوران بھی انہوں نے پورے عزم و یقین کے ساتھ کہا کہ ؎

فطرت سرمایہ داری میں تضادِ مرگ ہے
یہ نظامِ جبر مٹ جائے تو دنیا سورگ ہے

سنہ ۱۹۶۷ء کے بعد جب آمریت کے خلاف سیاسی جدوجہد کا نقارہ بجا تو پورے ملک کے پسماندہ عوام سڑکوں اور بازاروں میں امڈ آئے اور آمریت کے خلاف جمہوری قدروں کا علم بلند کرنے والوں کو جیت سے ہمکنار کیا۔ مسلم شمیم نے عوام کے اس

کردار اور ان کی یکجائی کی قوت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی نظم میں کہا کہ ؎

عوام جاگ اٹھے ہیں ضمیر جاگ اٹھا
طلسم ہوش ربا کا اسیر جاگ اٹھا

عوام کی ایکتا کی قوت تاریخی حقیقت ہے قطع نظر کہ انہیں اپنی صبر آزما جدوجہد کے نتیجے میں گھاٹا ہو جیسا کہ ہمارے یہاں ہو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر عوام دشمن انقلاب بھی اس دور کا بڑا المیہ ہے۔ لمحۂ موجود کے بعض ترقی پسند بھی اس صورتِ حال سے فریب کھاگئے اور نیو ورلڈ آرڈر کے جمہوری و اقتصادی اور مارکٹ سسٹم کے بعض اجزا سے مرعوبِ نظر آنے لگے۔ یہ بے خبری بجائے خود سانحہ ہے۔ ان معاصر بین الاقوامی مسائل پر اینگلو امریکی دانشوروں کے وہ تجزیے جو سنہ ۱۹۹۰ء کے بعد سامنے آئے ہیں قطعی مختلف اور بہت امید افزا ہیں۔ امریکہ کے بزرگ شہرۂ آفاق فلسفی لیمنٹ کارلس (LAMONT CORLISS) جو باغی کے لقب سے پہچانا جاتا ہے اپنی بحث ختم کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہونچا کہ سوشلسٹ ملکوں کی انحراف پسند قیادت نے جس بحران کو پیدا کیا وہی بین الاقوامی سطح پر سوشلسٹ انقلاب کے مستقبل کی دلیل ہے بقول کارلس کہ امریکہ کو زرعی نو آبادی دور سے جدید صنعتی سرمایہ داری تک پہنچنے میں تین سو سال سے زیادہ کا عرصہ لگا تو اب موجود نقطۂ انتہا سے گر کر انقلاب کی منزل تک پہنچنے میں کم سے کم سو سال تو لگیں گے اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے اس نے جن دلائل و شواہد سے کام لیا ہے ان میں فطرتِ سرمایہ داری کا تضاد بھی شامل ہے (اے لائف ٹائم ڈیسنٹ۔ پرومیتھیس بکس، نیویارک ۱۹۸۸ء)

جدیدیت اور جدید کے دعوے کہ شاعری کو عوام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے، دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا والی بات ہے اینگلو امریکی شاعری کی تاریخ

عوامی اسلوب و لب و لہجے سے محروم نہیں ہے بلکہ بقول گستاؤ کلاوس (GUSTAU KLAUS) شعر و ادب کے مورخوں نے عوامی شعر و ادب کے اعلیٰ ترین شاہکاروں کو تاریخ کے دھارے سے ہی نکال پھینکا تھا (لٹریچر آف لیبر ہارورڈ یونیورسٹی پریس لندن سنہ ۱۹۸۵ء) فلپ لیوائین (PHILIP LEVINE) کا تازہ شعری مجموعہ "سیاکیٹڈ پوئمز، مطبوعہ اے ناف نیویارک سنہ 1991ء عوام کو ہی مخاطب کرتا ہے۔

For now there would be poor

asking for their share, and

hurt men in uniforms. (Dog poem)

مسلم شمیم کی شاعری میں بھی ایسی نظمیں و غزلیں موجود ہیں جن کے مخاطب عوام ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرنے والے اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ وہ صنف نظم و غزل ہر دو اصناف پر یکساں حاوی نظر آتے ہیں۔ نظموں میں سیاسی و سماجی اور ثقافتی و اقتصادی آئیڈیالوجی تاثراتی و جمالیاتی پس منظر میں جھلکتی ہے اور کسی حد تک مارکسی جمالیات کے ان اصولوں کی تکمیل کرتی ہے جن کو جارج لیوکاس نے مرتب کیا ہے۔ ان کی شاعری پر یقیناً کلاسیکی رنگ و آہنگ کا غلبہ محسوس ہوتا ہے تاہم موضوعاتی جہت جدید عصری حسیت اور تقاضوں ہی کی ترجمان ہے۔ کلاسکس کی فضا میں سانس لیتے ہوئے اپنے عہد کے تقاضوں اور احساس کو اتنی جامعیت کے ساتھ پیش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سنہ ۱۹۹۰ء کے بعد البتہ انہوں نے نظمیں کم اور غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں خواب دیکھنے اور خوابوں کو سمیٹ کر زندہ رہنے کا جو احساس نمایاں ہوا ہے وہ کسی محرومی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان میں ٹوٹنے اور بکھرنے کا غم بھی شامل ہے اور رومانی جمالیات کی پناہ گاہ کی طرف سفر کا رجحان بھی جو عارضی ہی ایک نیم فراری کیفیت کا احساس دلاتا ہے۔

ریاض صدیقی

امکان

نشوی واقفِ یک نکتہ زِ اسرارِ وجود
تا نہ برگشتہ شوی دائرۂ امکاں را

(حافظ)

یاربِ خیر!

مصلوب روح عصر ازل سے ہے آج تک
ہستی پہ جبر و جور کا کب اختتام ہو
صدیوں سے جن دعاؤں پہ تکیہ کئے ہیں ہم
مفہوم ان دعاؤں کا اب سب پہ عام ہو
تو ربِ شر نہیں ہے تو شر سرخرو ہو کیوں
یاربِ خیر ، شر کو شکستِ دوام ہو

اگست ۱۹۹۱ء

حرفِ سپاس

یا رحمتِ تمام ، ضمیرِ حیاتِ کن
روئے زمیں کو بارشِ شبنم نصیب ہے
اہلِ نظر سے عرش کا رشتہ عجیب ہے
صدیوں سے روحِ عصر کی قسمت صلیب ہے

یا نورِ کائنات فزوں تر ہو روشنی
تاریکیوں کی قید میں کب سے ہے آگہی
زنجیرِ جبر و جہل میں جکڑی ہے زندگی
لوحِ جہاں پہ حرفِ مسلسل ہے تیرگی

امکان

یا کل حسن و عشق محبت ہو سرخرو
نفرت کدوں سے شہر وفا کو ملے نجات

اک عرصۂ دراز سے دن بھی یہاں ہے رات
ظلمت کی چیرہ دستی کو حاصل نہ ہو ثبات

درپیش کارواں کو لہو کی ڈگر ہے آج
رستے میں زندگی کے عجب رہگزر ہے آج

پھر کربلا ہے معرکۂ خیر و شر ہے آج
پھر مہر نیمروز کا نیزے پہ سر ہے آج

پھر عدل کا سفیر ہوا قتل راہ میں
پھر ظلم سربلند ہے سب کی نگاہ میں

ہیں دم بخود کھڑا ہوں کسی قتل گاہ میں
حرف سپاس ہوں میں تری بارگاہ میں

۲۵ مارچ ۱۹۹۲ء

گوتم کوئی گھر سوتا ہوا چھوڑ کے نکلے
یا دھرم نیا پیار کا ، آکاش سے اترے

سپنوں کے گھروندے تو سبھی ٹوٹ چکے ہیں
ڈر ہے کہ یہ اجڑا ہوا گھر اور نہ اجڑے

اب شہر نگاراں پہ ہے آسیب کا سایہ
سڑکوں پہ نظر آتے ہیں راتوں کو فرشتے

امکان

ہر لمحہ ڈسے جانے کا ہے خوف رگوں میں
گلیاں میرے خوابوں کی ہیں سانپوں کے بسیرے

کھیتوں میں لگی آگ :بجھائے ہنیں بجھتی
ٹکڑا کوئی بادل کا یہاں ٹوٹ کے برسے

اک عمر شمیم آپ کی اس چاہ میں گذری
تپتے ہوئے صحراؤں میں چشمہ کوئی پھوٹے

۱۹۹۱ء

یہ نفرتوں کا سلگتا الاؤ کیسا ہے
یہ کاروان سحر کا پڑاؤ کیسا ہے

لہولہان ہے پیشانی صبا کیونکر
بدن پہ اہل گلستاں کے گھاؤ کیسا ہے

محبتوں کی روش میں بپا ہے رقص شرر
یہ شہر عشق وفا میں تناؤ کیسا ہے

امکان

متاعِ درد کہ ہے اپنا مشترک ورثہ
میانِ ہم نفساں بھید بھاؤ کیسا ہے

سمٹ رہے ہیں اجالے افق کی باہنوں میں
اندھیری رات کا یہ چل چلاؤ کیسا ہے

نہ خوفِ کم نگہی ہے نہ خدشۂ شب خوں
شعورِ جہت سے عاری بہاؤ کیسا ہے

صلیب و دار کے موسم پہ گفتگو نہ سہی
دیارِ حسن کا اب رکھ رکھاؤ کیسا ہے

جبینِ فکر پہ زخموں کی کیفیت کیا ہے
ہجومِ شوق کا عالم بتاؤ کیسا ہے

شمیم قیمتِ جنسِ حیات کیا ٹھہری
لہو کا شہر نگاراں میں بھاؤ کیسا ہے

۱۹۸۹ء

نذرِ حسرت موہانی

زخموں کی فراوانی ، قاتل کی شکایت بھی
کس درجہ انوکھی ہے یہ رسمِ محبت بھی

اس شہر خموشاں میں کیا سازِ غزل چھیڑیں
محفوظ یہاں کب ہے احساس کی دولت بھی

ساقی کی نگاہوں کے معصوم اشاروں میں
جینے کی ہیں تاکیدیں مرنے کی اجازت بھی

ہم کفر محبت کے فانوس جلاتے ہیں
سر آنکھوں پہ اپنے ہے قاتل کی یہ تہمت بھی

پوچھیں تو شمیم ان سے کیا ظلم کا حاصل ہے
راس آ نہ سکی جن کو شداد کی جنت بھی

۱۹۶۴ء

نذرِ مخدوم

بریدہ دست و قلم کی برات لے کے چلو
حریمِ جبر میں شمعِ حیات لے کے چلو

فریبِ شب ہی سہی آج قصرِ ظلمت میں
سحر کی بات چلی ہے یہ بات لے کے چلو

ستم کشو! خلشِ زخمِ اعتبار کے ساتھ
جراحتِ نگہِ التفات لے کے چلو

یہ رسمِ سنگ زنی اجنبی سی بات نہیں
جبینِ شوق پہ نقشِ ثبات لے کے چلو

شمیم! جنسِ وفا زندگی کے میلے سے
خریدنا ہے تو نقدِ حیات لے کے چلو

۱۹۶۲ء

نذرپرویز شاہدی

یوں مضطرب رہا ہوں تری اک نظر کے بعد
جیسے کہ بادہ نوش مئے مختصر کے بعد

مقتل میں لے کے نذرِ دل و جاں چلو، چلیں
منزل بہت قریب ہے اس رہگذر کے بعد

شاید کہ اعتبارِ وفا آگیا انھیں
ہیں وہ بہت اداس مری چشمِ تر کے بعد

آرائشِ جمال سے محروم و بے نیاز
دوشیزۂ غزل ہے جنابِ جگر کے بعد

درپیش حادثے ہوئے کیا سانحے ہوئے
"لیں گے سفر کا جائزہ ختمِ سفر کے بعد"

دھبا لہو کا نقشِ سوالات بن گیا
کنجِ قفس میں تذکرۂ بال و پر کے بعد

۱۹۶۱ء

ماروی کا دیس

زندگی ظلم و تشدد سے ہراساں نہ ہوئی
آگہی معرکہ، خوں سے گریزاں نہ ہوئی
روح بیدار کبھی خوف سے لرزاں نہ ہوئی
عظمتِ فکر زر و مال کی خواہاں نہ ہوئی
حسن کی چشم سحر خیز پشیماں نہ ہوئی
ماروی شیش محل دیکھ کے شاداں نہ ہوئی

آج اس دیس کے کچھ لوگ ہمیشہ کی طرح
چند سکوں کے عوض عزتِ فن بیچتے ہیں
جنس احساس وفا دل کی لگن بیچتے ہیں
اپنی تہذیب کی حرمت کا کفن بیچتے ہیں
خون گل، نکہت و تقدیس چمن بیچتے ہیں
ناز اس پر ہے کہ ناموس وطن بیچتے ہیں

امکان

سندھ آغازِ تمدن کا درخشاں مہتاب
سندھ تاریخِ محبت کی سنہری سی کتاب
سندھ کی عظمتِ دیرینہ پہ حیراں ہے نگاہ
سندھ کی بیکسی حال پہ گریاں ہے نگاہ
چند لوگوں کے لئے راج بھی ہے تاج بھی ہے
سندھ عشرت کدۂ اہلِ ہوس آج بھی ہے

کھیت ہر سال اگلتے ہیں خزانے لیکن
شجرِ درد کے سائے ہیں کہ بڑھتے ہی رہے
لوگ افلاس کی آغوش میں دم توڑ چلے
جہل کی رات کے گیسو بھی مہکتے ہی رہے
ہر نئی صبح یہاں غم کی خبر لاتی ہے
وقت کے پاؤں کی زنجیر بدل جاتی ہے

۱۹۶۲ء

نذرِ جون ایلیا

اک شخص اٹھ کے کوئے ملامت سے گھر گیا
اس سانحے کو ایک زمانہ گذر گیا

پیاسی تھیں مدتوں سے محبت کی کھیتیاں
سیراب ان کو ابرِ شرربار کر گیا

فصلِ خزاں کی ایسی پذیرائیاں ہوئیں
خونِ صبا بھی اہلِ گلستاں کے سر گیا

امکان

اب سرحدِ خیال پہ پہرہ جنوں کا ہے
ہر قافلہ خرد کا یہاں سے گذر گیا

موسم پہ انحصار ہے دھوپ اور چھاؤں کا
میلا کبھی ہوا کبھی چہرہ نکھر گیا

دل کا غرور ان کی توجہ کا عکس تھا
بارش تھمی تو آپ ہی دریا اتر گیا

نظارۂ جمالِ سحر کے لیئے شمیم
کچھ اور دیر شب کا مسافر ٹھہر گیا

۱۹۸۳ء

○

چار سو خوفِ تیرگی ہے بہت
شب کو احساسِ برتری ہے بہت

حکم تازہ ہے ان کو گل کر دو
جن چراغوں سے روشنی ہے بہت

نخلِ جاں پھر جھلس نہ جائے کہیں
دھوپ احساس کی کڑی ہے بہت

امکان

جامِ مے ہو کہ ساغرِ زہراب
کچھ بھی آئے کہ تشنگی ہے بہت

درد کا چاند ہی نکل آئے
دل کے صحرا میں تیرگی ہے بہت

کم نہ تھا جہل کا عذاب شمیم
اور اب کربِ آگہی ہے بہت

۱۹۸۳ء

ظلمتِ شب سحر ڈھونڈ لے گی
گمرہی راہبر ڈھونڈ لے گی

بزم میں شمع کی سادہ لوحی
رمزِ رقصِ شرر ڈھونڈ لے گی

باہمہ لذتِ غم جہاں میں
زندگی ہمسفر ڈھونڈ لے گی

فطرتِ طائرِ کوہساراں
شوکتِ بال و پر ڈھونڈ لے گی

سایۂ زلف میں چشمِ شاعر
ربط شام و سحر ڈھونڈ لے گی

۱۹۵۹ء

امکان

○

اس دنیا میں چین کہاں ہے صدیوں کے دکھیاروں کو
امرت کہہ کر زہر پلائیں لوگ یہاں بیماروں کو

ہم دھرتی پر رہنے والے ظلم کو قسمت کہتے ہیں
ہم نے نیا مفہوم دیا ہے شعلوں کو انگاروں کو

ہم چڑھتے سورج کے پجاری سانجھ سویرا کیا جانیں
ہم جگ جگ سے کہتے آئے اجیارے اندھیاروں کو

جن کے دم سے دیپ جلے وہ خود ظلمت کے سائے ہیں
در در کی ٹھوکر ملتی ہے جگ کے پالن ہاروں کو

دکھ سکھ اپنے ساجن ساتھی جیون پریت کا ساگر ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے بھول جا بچھڑے یاروں کو

جولائی ۱۹۹۳ء

جو زہر غم کا پیمانہ ہمارے نام ہے ساقی
سر آنکھوں پر یہی گر عشق کا انعام ہے ساقی

یہاں احساس محرومی کا چرچا عام ہے ساقی
یہ کیا کم ہے ابھی کچھ احترامِ جام ہے ساقی

ہوس ہے جس کا مسلک خود پرستی زندگی جس کی
وہ تیری انجمن کا رندِ خوش انجام ہے ساقی

امکان

لبِ ہر غنچہ پر ہے ثبت اک افسانۂ حسرت
یہ کیسا موسمِ گل ہے صبا بدنام ہے ساقی

شکستِ تیرگی کے ساتھ ہم اہلِ محبت پر
گلوں کی ترجمانی کا بھی اک الزام ہے ساقی

عبارت ہے غمِ دوراں سے اپنا حسنِ فن پھر بھی
ابھی کچھ دل میں یادِ قربتِ اصنام ہے ساقی

۱۹۶۸ء

دھوپ چھاؤں

آتش نفسی کرنے لگی گلبدنی بھی
پتھر کی زباں بولتی ہے سیم تنی بھی
دینے لگی ہے دھوپ کی لو چھاؤں گھنی بھی
کچھ اور توانا ہوا یہ درد کا رشتہ
اچھی لگی ہے آج مجھے دل شکنی بھی

جنوری ۱۹۹۲ء

شیشۂ دل شکستہ تر رکھیئے
اپنے حالات پر نظر رکھیئے

قتلِ گل ہو کہ خونِ بادِ صبا
سارے الزام اپنے سر رکھیئے

روشنی کا سفر مدام رہے
زخم ماتھے پہ تازہ تر رکھیئے

دستِ قاتل پہ کیجیئے بیعت
خون اپنا خود اپنے سر رکھیئے

دولتِ اشک لٹ نہ جائے کہیں
گھر میں سامان مختصر رکھیئے

۱۹۸۴ء

امکان

نجد تنہائی ہے اور مصر کے بازار کا خواب
جامِ جمشید تھا ٹوٹا مرے پندار کا خواب

بارہا چاہوں کہ تعبیر اسی سے پوچھوں
وہ کہ ہے کب سے مرے دیدۂ بیدار کا خواب

اس کی زلفوں میں اُلجھتی گئیں نظریں فن کی
منتشر ہوتا گیا رقصِ سر دار کا خواب

موسمِ ہجر میں کھل جاتے ہیں قربت کے گلاب
جب مہک اٹھتا ہے اس کے لب و رخسار کا خواب

اک پری وش کے تصور میں، خیالوں میں شمیم
زندگی ہے کسی تمثیل کے کردار کا خواب

جولائی ۱۹۹۲ء

جس دیس میں پدما بہتی ہے

لاشوں کے انبار لگے ہیں، خون کی نہریں بہہ نکلیں
پدما کی موجیں ساکن ہیں
بوڑھی گنگا اشک فشاں ہے، نوحہ کناں ہے
کرنا فلی ہے سوگ میں غلطاں، سندر بن میں آگ لگی ہے
اپنے بیٹوں کی یادوں کو اپنے سینوں سے چمٹائے
لاکھوں مائیں سسک رہی ہیں، لاکھوں آنکھیں ہیں بے نور
لاکھوں مانگیں، اجڑ گئی ہیں، لاکھوں گھر ویران ہوئے
لاکھوں بچے اپنے باپوں کے سائے سے ہیں محروم
قتل عام کا جانے کب تک گرم رہے گا یہ بازار

امکان

شدادوں کی روح بھی شاید شرمندہ ہو، ششدر ہو
چنگیزی یلغار کے قصے، نادر شاہی ظلم کا ذکر
ہیچ ہیں
اپنے دیس میں ہونے والے خونی ناٹک کے آگے
سنگینوں کا راج ہے ہر سو، خیبر سے بولان تلک
سندھ کا سینہ دہک رہا ہے زخموں کے انگاروں سے
راوی اپنی آنکھ چرائے داتا کے چرنوں میں پڑی ہے
مرنے والے مجرم ٹھہرے، جرمِ وفا ان پر ثابت ہے
یہ ننگے بھوکے انسان
جینے کا حق مانگ رہے ہیں، رہنے کو گھر مانگ رہے ہیں۔
رسمِ غلامی کے منکر ہیں، طوقِ غلامی سے بیزار
جبر و تشدد کی زنجیریں کاٹ رہے ہیں
آزادی کے تیشے سے
پدما کی یہ جنگ نہیں یہ سارے دیس کی ہے تحریک
ظالم طبقے سے ہے یہ مظلوم عوام کی جنگ
راہزنوں سے قزاقوں سے مجبوروں کی جنگ
فسطائی دہشت گردی سے جمہوری اقدار کی جنگ
پدما کے بیٹوں کا خوں اپنا ہی خوں ہے
سندھ کا خوں پنجاب کا خوں ہے

امکان

خیبر کا بولان کا خوں ہے

سچائی انصاف کا خوں ہے عظمت کا غیرت کا خوں ہے

آزادی کی صبح کا سورج جھانک رہا ہے

زنداں کی دیواروں سے مقتل کے محرابوں سے

لاشوں کے میناروں سے

۱۴ اگست ۱۹۷۱ء

یکم مئی

قتلِ گل، قتلِ صبا، قتلِ سحر کی تقریب
منعقد ہوتی رہی بارہا ایوانوں میں
قلعہء جبر و تشدد میں
قصرِ ظلمت میں
خلوتِ شب میں
گاہے گاہے سرِ راہے
اور اس بار یہ تقریب بڑی شان کے ساتھ
منعقد اہلِ ہوس کے ہاتھوں
رہگذاروں پہ ہوئی
بر سرِ بازار ہوئی

امکان

کوچۂ شہرِ نگاراں میں ہوئی
دشت و صحرا میں ہوئی
کوہساروں میں ہوئی
نامِ گل، نامِ صبا، نامِ سحر وردِ زباں
ہر نفس گام بہ گام
محترم ہے روشِ مکر و فریبِ حکام
شیوۂ راہزنی کی خیر
پیشۂ قتل کی عظمت کی دہائی دیجے
دستِ قاتل کے تقدس کی قسم کھائی گئی
ساتھیو چلتے رہو
ہم روایاتِ شکاگو کے امیں
خونِ فیوچک کے تقدس کے امیں
عظمتِ خونِ لوممبا کے امیں
خونِ ناصر کے امیں
نذرِ خوں دیتے رہے ہیں
سرِ محفل، سرِ زنداں، سرِ مقتل، سرِ دار
نذرِ خوں دیتے رہیں گے ہم لوگ

۱۹۷۳ء

صحرا میں کنول

دل و نگاہ میں تم اس طرح سمائے ہو
کہ جیسے خون رگ و پئے میں رقص کرتا ہے
کہ جیسے انجمنِ غم میں شمع روشن ہو
کہ جیسے ظلمتِ شب میں چراغ جلتا ہو

امکان

یہ زندگی کہ جہاں ہر قدم پہ پہرے ہیں
روش روش پہ جہاں امتحانِ زنداں ہے
خلوصِ فکر و نظر جرم، کفر ٹھہرا ہے
صداقتوں کا پجاری حریفِ ایماں ہے

تمہاری یاد نہ ہوتی تو جل گیا ہوتا
اس آگ میں جو مرے ذہن میں فروزاں ہے
ترے جمال کے پرتو سے میری جانِ غزل
مرے وجود کے صحرا میں کھل اٹھے ہیں کنول

۵ فروری ۱۹۶۵ء

گیت

اپنے من کا بھید چھپائے شاعر گیت سنائے
بھیتر بھیتر آپ جلے ہے اوروں کو بہلائے

آشاؤں کی چتا رمائے نگر نگر منڈلائے
تنہائی میں سوگ منائے محفل میں مسکائے

من مندر میں آگ لگی ہے لب شبنم برسائے
اپنا گھر تاریک سمندر راہ میں دیپ جلائے

امکان

اپنے خون کی بھکشا دے کر جن کے محل سجائے
کٹیاؤں میں رہنے والا بھیک انہیں سے پائے

تپتی دھوپ میں بدن جلائے کھیت کی مانگ سجائے
جگ کی پیاس بجھانے والا خود پیاسا مر جائے

دھن دولت مایا ہے مورکھ پروہت کتھا سنائے
اپنے گھر کو سورگ بنائے جگ کو تیاگ سکھائے

۱۹۷۱ء

خلا کی گود

عروس امن کے ہونٹوں پہ ہمی ہمی سی
مچل رہی ہے تبسم کی کہکشاں بن کر
یہ زندگی جو کہیں پھول ہے جوانی ہے
کسی حسیں کا تکلم ، کسی صنم کا جمال
کسی کی زلف کا بادل کسی نظر کا خمار
کسی دمکتی جبیں پر حیا کی سرخ لکیر
جھکی جھکی سی نگاہوں کا سحر ہوش ربا

امکان

یہ زندگی کہ جو تہذیب آدمیت کو
سجائے پلکوں پہ کاجل کی طرح نازاں ہے
یہ زندگی جو تمدن کو اپنے سینے سے
لگائے رقص کناں ہے سحر کی راہوں میں
یہ زندگی کہ جو انسانیت کے پیکر میں
خلا کی گود میں فطرت سے ہمکلام ہوئی
یہ کائنات کے بربط پہ دلنشیں اک راگ
زمیں کی مانگ کا سیندور آسماں کا سہاگ
جلو میں قافلہ رنگ و نور لائی ہے
عروس امن کی آغوش میں در آئی ہے

۱۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء

اندھیری بستی

وقت شاہد ہے کہ ہر دور میں تہذیب کی مانگ
قتل گاہوں کے تبسم سے شفق رنگ رہی
جن کے خوں سے ہے رخ زیست کی رنگت ، ان کی
بھوک افلاس کی ناگن سے سدا جنگ رہی

جن کی محنت سے ہے محلوں کے مکینوں کا غرور
زندگی ان کے لئے دکھ کی اندھیری بستی
لوٹ قدرت کی مشیت ہے خدا کا منشا
اس کھلے جھوٹ کی تائید نہیں ہو سکتی

امکان

دھوپ کی آتشیں چادر میں جھلستا ہوا جسم
کتنی صدیوں سے ہے تاریخ تشدد کا جمال
حکم ہے مقتل و زنداں کے نگہبانوں کا
آدمیت کے تقدس کا اٹھاؤ نہ سوال

عشرتِ زیست مقید رہی ایوانوں میں
اہلِ محنت کے لئے درد کا سرمایہ ہے
چند افراد نے فطرت کا تقاضا کہہ کر
ظلم کو عشق کی تقدیر بنا رکھا ہے

خوف کے ابر سے انصاف کی شبنم برسے
اس حقیقت کی حقیقت کو کوئی کیا سمجھے
لوٹنے والے خدایانِ جہاں ٹھہرے ہیں
اس تمدن کے تقدس کو بھلا کیا کہیے

جھوٹ ہر سچ کی ہے بنیاد جہاں کیا کہیے
جرم اظہارِ صداقت ہے یہاں کیا کہیے

۱۹۶۷ء

میں کون ہوں

کس سے پوچھوں کہ جھوٹ سچ کیا ہے
تیرگی کیا ہے روشنی کیا ہے

کون معیارِ خیر و شر سمجھائے
کون تکذیبِ جبر و جہل کرے

وقت کس سمت ہے رواں پیہم
وجہِ تخلیق و ارتقاء کیا ہے

امکان

زندگی وہم ہے حقیقت ہے
شجرِ درد سایۂ غم ہے

کس سے مفہوم ما و من پوچھوں
کون تقدیرِ حسن و عشق بتائے

کس سے پوچھوں صلیب و دار کا راز
عظمتِ جامِ زہر کون بتائے

عقل و دانش پہ کفر کے فتوے
فکر و فن پر ہے تہمتِ الحاد

اس تقدس مآب دنیا میں
کس سے پوچھوں میں کون ہوں کیا ہوں

کوئی افسانہ کوئی خواب ہوں میں
کوئی تحریرِ ناتمام ہوں میں

کوئی صحرائے درد و کرب ہوں میں
خوف و خدشات کے جہنم میں
کتنی صدیوں سے جل رہا ہوں میں

۲۵ اپریل ۱۹۷۰ء

لہو کا ٹیکا

یہ اونچ نیچ ، یہ نفرت ، یہ جہل ، یہ افلاس
زمیں پہ کس نے لگائے یہ زہر کے پودے
کہ جن کے سائے میں انسانیت سسکتی ہے
کہ جن کی چھاؤں میں ہوتے ہیں موت کے سودے

فریب و کذّب کے سر پر ہے تاج زرافشاں
صداقتوں کی جبیں پر لہو کا ٹیکا ہے
پہنا کے ظلم کو کس نے لبادۂ تقدیس
گلوں کے نام پہ صدیوں چمن کو لوٹا ہے

امکان

ثنائے جبر و ستم ہے ادب کا شہ پارہ
خلوصِ فکر و نظر عیب ہے فسانے میں
حقیقتوں کا بیاں ہے بغاوتِ احساس
اصول سب سے بڑا جرم ہے زمانے میں

شکستِ دل کو سمجھتے ہیں عشق کی عظمت
ان آنسوؤں سے چراغوں کا کام لیتے ہیں
دکھوں کے شہر میں بے کیف سی ہنسی کے لئے
ہم اپنے ذہن کو پہروں فریب دیتے ہیں

بھٹکتے رہتے ہیں احساس کے بیاباں میں
ضمیرِ فن کو سیہ ناگ ڈستے رہتے ہیں
نظر سے اہلِ زمانہ کی ہو کے پوشیدہ
ہم اپنی فکر کے شعلوں میں آپ جلتے ہیں

۲۱ فروری ۱۹۶۵ء

نذرِ یگانہ

حریمِ جبر میں خاموش بھی رہا نہ گیا
سفیرِ شب کو نقیبِ سحر کہا نہ گیا

عجیب کیفیتِ کرب ہے فضاؤں میں
گلوں نے بارہا چاہا مگر ہنسا نہ گیا

شبِ ستم کا بیاں جرم ہی سہی کیجیے
گماں نہ ہو کہ سرِ بزم کچھ کہا نہ گیا

امکان

خیالِ خاطرِ ساقی کی خیر رندوں میں
کہیں بھی تذکرۂ تشنگی سنا نہ گیا

دیارِ عشق ہے گویا دیارِ کرب و بلا
یہاں سے اٹھ کے کوئی دردِ آشنا نہ گیا

عجب طرح کے مسافر تھے ہم کہ بیٹھ رہے
بھٹک کے راہ سے دو گام بھی چلا نہ گیا

ہزار مرحلۂ جبر سے ہوئے دو چار
دلِ شمیم سے جینے کا حوصلہ نہ گیا

۱۹۶۸ء

بجھتا سورج جلتا دیپ

ہر قدم پہ اک احساس ذہن و دل کی دنیا میں
کچھ دیئے جلاتا ہے کچھ دیئے بجھاتا ہے
سوچتا ہوں کیا اب بھی آنسوؤں کے یہ موتی
میرے عشق کی تقدیر میرے عشق کا انعام
تیری آنکھ کا تارا تیرے حسن کا انجام
میری جہد کا ثمرہ میری روح کا دمساز
میری صبح سے پہلے میری شام کا آغاز

امکان

سوچتا ہوں کیا اب بھی آنسوؤں کے یہ موتی
میرے شعر کی زینت میرے عشق کی منزل
میرے عزم کا محور، میری فکر کا حاصل
خون بن کے ٹپکیں گے زندگی کی آنکھوں سے
جم رہیں گے دامن پہ عظمتِ محبت کے

ہر قدم پہ اک احساس ذہن و دل کی دنیا میں
کچھ دیئے جلاتا ہے کچھ دیئے بجھاتا ہے
زندگی کی محفل ہے زندگی سے بیگانہ
میکدہ محبت کا جیسے کوئی ویرانہ
جام دل کی کیفیت جیسے خشک اک تالاب

جیسے تشنہ لب سارے منتظر ہوں پنگھٹ پر
جیسے رہگزاروں میں انتظارِ باراں ہو
مضطرب نگاہوں میں اضطراب کے شعلے
بیقرار کب سے ہیں کہکشاں سجانے کو
اپنے صحن ویراں کو اپنی ارض زنداں کو
کون جانے کب بدلے میرے خواب کی تعبیر
کون جانے کب بدلے دشتِ زیست کی تقدیر

امکان

ہر قدم پہ اک احساس ذہن و دل کی دنیا میں
کچھ دیئے جلاتا ہے کچھ دیئے بجھاتا ہے
ہر طرف یہ خاموشی ہر طرف یہ تاریکی
جیسے کوئی مقتل ہو جیسے کوئی زنداں ہو
جیسے دل کی نگری میں ماتمِ بہاراں ہو
جیسے زخمِ نو کوئی عہدِ گل پہ خنداں ہو
جیسے ایک ساحل کو انتظارِ طوفاں ہو
پھر بھی آرزوؤں کا اک چراغ جلتا ہے
منزلِ محبت کا کچھ سراغ ملتا ہے
بجھ گیا ہے قسطوں میں دل کہ ایک سورج تھا
دیپ ایک جلتا ہے من نگر میں سپنوں کا

۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء

امکان

○

موضوعِ حسنِ شعر پہ وہ بولتے رہے
کانوں میں دیر تک مرے رس کھولتے رہے

اٹھتی رہی نگاہ برستا رہا خمار
بیٹھے وہ زلفِ فن کی گرہ کھولتے رہے

اک کہکشاں ابھرتی رہی حرف و صوت کی
موتی تخیلات کے وہ رولتے رہے

کیا سحر اس نے کر دیا ہنگامِ گفتگو
پہروں ہم اپنے آپ سے کچھ بولتے رہے

وہ روبرو تھے اور خیالوں میں ہم شمیم
میزانِ آرزو میں غزل تولتے رہے

نومبر ۱۹۹۲ء

چاند شخصیت اس کی

چاند شخصیت اس کی فکر میں در آئی ہے
مہرباں نگاہوں سے چاندنی ٹپکتی ہے
جیسے کنج ویراں میں روشنی برستی ہو
ریگ زارِ ہستی میں جیسے برف باری ہو

رنگِ پیراہن اس کا خوشبوئے بدن اس کی
روح میں سمائی ہے بوئے شعر و فن اس کی
بات پہروں کرتی ہے چشمِ آرزو اس کی
وادی تصور میں ضو ہے چار سو اس کی
فکر میں در آئی ہے چاند شخصیت اس کی

۱۹۹۲ء

شکست و فتح

بجھے بجھے سے ہیں شاعر کے ذہن و دل کے دیئے
بھٹک رہا ہے کہاں جائے روشنی کے لئے
روش روش پہ درخشاں ہے برق خوف و ہراس
جھلس رہے ہیں در و بام جذبہ و احساس
نظر اداس ہے ویراں ہیں سارے نظارے
جبین صبح سے پھوٹے لہو کے فوارے

امکان

زمیں پہ لاشوں کے گلشن فضا میں خوں کی نمی
اب اہتمامِ بہارِ چمن میں کیا ہے کمی
جمالِ صبحِ وطن آنسوؤں میں مدغم ہے
عروسِ فصلِ بہاراں کی آنکھ پُر نم ہے
بہ فیضِ جبر و ستم غم نے فتح پائی ہے
وفا کے نام پہ دل نے شکست کھائی ہے

شعارِ دیدہ وری سے گلوں کے شاد نہیں
چمن کے پھول چمن ہیں یہ ان کو یاد نہیں
ستم کو اہلِ ہوس بھی ستم سمجھتے ہیں
یہ اور بات ہے شعلوں کو پھول کہتے ہیں
سمٹتی رات کے سائے سحر کی راہ میں ہیں
ہم اور چند گھڑی ظلم کی پناہ میں ہیں

۵ جنوری ۱۹۶۵ء

اپنی غزل کے شعر دعا کی طرح لگے
وہ بت بھی بے نیاز خدا کی طرح لگے

جب بھی اٹھی نگاہ مجھے شبنمی لگی
پیاسی زمینِ دل کو گھٹا کی طرح لگے

جس نے مجھے گدازِ سراپا بنا دیا
مجھ کو جہاں ملے وہ صبا کی طرح لگے

جب بھی وہ سائبانِ توجہ سمیٹ لے
اپنا وجود دشتِ بلا کی طرح لگے

ہے چھاؤں اس کا دھیان کڑی دھوپ میں شمیم
تپتے ہوئے بدن پہ ردا کی طرح لگے

جذبہ و احساس کی شدت کا اندازہ ہوا
ہر نفس ، ہر سانس میں چاہت کا اندازہ ہوا

خواب چہرہ ، سرد لب ، آنکھوں میں چنگاری کی رت
وقتِ رخصت دل کی کیفیت کا اندازہ ہوا

ہجر کا موسم جب آئے وصل کی خوشبو کھلے
فاصلوں کے درمیاں قربت کا اندازہ ہوا

قطرۂ شبنم میں دیکھوں شعلگی کا مدوجزر
صبح سے ہی شام کی صورت کا اندازہ ہوا

دیکھ کر آتش بجاں کچھ مضطرب وہ بھی ہوئے
ان سے مل کر درد کی دولت کا اندازہ ہوا

امکان

محرومِ دید دیر سے شہرِ بتاں میں ہیں
عشاق آج مرحلۂ امتحاں میں ہیں

کس درجہ تیز دھوپ ہے سچائیوں کی آج
اہلِ یقیں بھی سایۂ نخلِ گماں میں ہیں

جنت بدر ہوا کبھی مصلوب میں ہوا
ایسے کئی مقام مری داستاں میں ہیں

صرصر بھی ہے صبا بھی ہے، بادِ شمال بھی
موسم بہ یک شمار کئی گلستاں میں ہیں

منسوب ان کے نام جو کی اس کتاب میں
منظوم کچھ خطوط غزل کی زباں میں ہیں

۱۹۹۲ء

جائزہ

اپنے احساس کے آئینے میں خود کو دیکھا
اک سمٹتا ہوا سایہ ہوں بکھرتا ہوا پھول
ایک تپتا ہوا صحرا ہوں سلگتا ہوا شہر
درد کا سروِ رواں ، دکھ کا شجر ، وحشتِ خلوص
اک فنکار ہوں سرمایہ مرا خونِ جگر
زندگی بارہا شعلوں میں گرفتار ہوئی
بارہا فکرِ دل و جاں بھی شرربار ہوئی

امکان

اپنے ماحول کے معیار پہ خود کو پرکھا
ایک مجرم ہوں مرا جرم وفا کی تشہیر
عظمتِ ظلم کا منکر ہوں شبِ غم کا حریف
آدمیت کا تقدس ہے مرے فن کا جمال
حق پرستی مرے افکار کا سرچشمہ ہے

ایک مشرک ہوں، مرا شرک، محبت سب سے
ایک کافر ہوں، مرا کفر، صداقت پہ یقیں
یہ درو بامِ ہوس، تمکنتِ قصرِ ستم
رات کٹ جائے گی کھل جائے گا ظلمت کا بھرم

۱۹۶۸ء

کامریڈ ھوچی منہ

ایک مینارۂ عظمت ہے تیری شخصیت
سرخرو بارگہہ درد میں انسان ہوا
سربلندی محبت کی علامت کہیے
جہل شرمندہ ہوا ، ظلم پشیمان ہوا

چہرۂ جبر و تشدد سے تقدس کا نقاب
نوچ پھینکا سر مقتل ترے دیوانوں نے
بارش خون دل و جاں سے بجھا دی سر بزم
جھوٹ کی شمع فروزاں تیرے پروانوں نے

امکان

دستِ مظلوم میں ہے آج گریبانِ ستم
قصرِ نفرت میں ہے ماتم کہ ہوئی پیار کی جیت
ہم سمیٹے ہوئے سیلابِ گہر آنکھوں میں
گنگناتے ہیں تیری رفعتِ کردار کے گیت

دردمندانِ محبت کے دلوں کی دھڑکن
مشعلِ حریتِ فکر و نظر مہرِ یقیں
تیری جرأت کے فسانے ہیں لبِ ہر گل پر
سرنگوں ہے تری راہوں میں ستاروں کی جبیں

افقِ وقت پہ اک شعلہ تابندہ ہے
تیری تحریک سلامت رہے تو زندہ ہے

ایک تصویر

راہِ الفت کی روایاتِ کہن زندہ ہیں
سر بکف اہلِ وفا بہر تماشا گذرے
درد کی رات وہی کرب کا احساس وہی
آمدِ صبحِ تمنا کا گماں کیا گذرے
خوف کلیوں کا تبسم بھی چرا لیتا ہے
افقِ جبر اندھیروں کا پتا دیتا ہے

امکان

ایک تصویر جو آویزاں تھی ایوانوں میں
خون کا غازہ ملے حسنِ ستم ہو جیسے
پیکرِ تمکنت و ناز و غرورِ باطل
درِ زنداں پہ تشدد کا علم ہو جیسے
اب وہ تصویر کسی گوشۂ ایواں میں نہیں
ذکر اس بت کا کسی بزمِ شبستاں میں نہیں

اس سے پہلے بھی کئی بار ہوا ہے ایسا
پھر بھی اربابِ ہوس زہر ہوس پیتے ہیں
آدمیت کا تقدس ہے پشیماں ان سے
دستِ تعزیر سے زخموں کے دہن سیتے ہیں
وقت کا سلسلۂ شام و سحر یاد نہیں
ان کو تاریخ کا اندازِ سفر یاد نہیں

۱۹۶۹ء

متاعِ شعر

میں اس کو دیکھوں تو جاگے شعورِ خوابیدہ
میں اس کو سوچوں تو پھوٹے افق پہ صبح کی پو
ردائے شب کو سمیٹے کرن تمنا کی
رہِ حیات سے ظلمت کا کارواں ہٹ جائے

صنم کدہ وہ محبت کا ، اس کی دیوی بھی
میں اس کو حسن لکھوں ، حسن کی کتاب لکھوں
کنول تراشوں کہ چہرے کو اک گلاب لکھوں
شبیہہ فکر لکھوں ، پیکرِ خیال لکھوں
متاعِ شعر لکھوں شعر کا جمال لکھوں

امکان

سلوک لہجے کا اس کے کہ جیسے امرت رس
وہ جاں فریبیِ اظہار ، دل نواز سخن
جبیں پہ وسعتِ قلب و نظر کی تحریریں
حدیثِ مہر و وفا کی حسین تفسیریں
غرورِ عشق ان آنکھوں کا احترام کرے
وہ آسماں ہے زمیں اس سے کیا کلام کرے

۱۹۹۲ء

غزل نما

گوشہ دل و نگاہ کا ، احساس کا نگر
اک عرصہ دراز سے اک شخص کا ہے گھر
وہ پیکرِ شعور ہے ، وہ جنتِ نظر
دشتِ وفا میں جیسے کوئی سایہ، شجر

اظہار میں صبا کی لطافت رچی ہوئی
لہجے میں اعتبار کی خوشبو بسی ہوئی
آنکھوں میں اس کی فکر کی مشعل جلی ہوئی
لب پر شگفتِ گل کی کرن پھوٹتی ہوئی

امکان

قامت کا اس کی سحر کہ سوچا کریں جسے
چہرہ کتاب شعر کہ پڑھتے رہیں جسے
وہ برف زارِ زیست میں چاہت کی دھوپ ہے
رانجھا کی ہیر کرشن کی رادھا کا روپ ہے

وہ سینۂ سخن میں محبت کا راز ہے
وہ شخص خود غزل ہے غزل کا جواز ہے

۱۹۹۱ء

نذرِ جگر

گذشتہ شب ہمہ اوقات غرقِ جام رہے
کبھی خدا سے کبھی اس سے ہمکلام رہے

دعائے آخر شب میں اسی کو مانگا ہے
جو قتلِ حرفِ تمنا پہ شادکام رہے

کبھی جو آئی بھی تکمیلِ آرزو کی گھڑی
جو ناتمام تھے قصے وہ ناتمام رہے

دیئے بجے ہیں پلکوں پہ دل سلگتا رہے
وہ آئے یا کہ نہ آئے یہ التزام رہے

لہو لہو دل و جاں ہوں پر اپنے قاتل کا
شمیم کچھ بھی ہو ملحوظ احترام رہے

امکان

○

کچھ ارتباط عجب حرفِ خوں چکاں سے رہے
غزل کے رشتے سدا کوچہء بتاں سے رہے

ہے اپنا پیار پہ اصرار اک پری وش سے
زمیں کا ربط کسی طور آسماں سے رہے

یہ جان کر کہ اسے لفظ جاں سے کد سی ہے
تعلقات کشیدہ خود اپنی جاں سے رہے

حیا بکھرتی رہی اس کے عارض و لب پر
مذاکرات بڑے چشم مہرباں سے رہے

وہ دور تر رہے جن ساعتوں میں مجھ سے شمیم
قریب تر وہ سوا اور میری جاں سے رہے

مارچ ۱۹۹۲ء

محبت کا شوالہ

حق بات ہے اس دور میں تخریب پسندی
باطل کی ستائش میں ہے انساں کی بلندی

تائیدِ ستم شیوۂ اربابِ ہنر ہے
زندان و رسن مرتبۂ اہل نظر ہے

مجرم ہیں جو ظلمت کو اجالا نہیں کہتے
مقتل کو محبت کا شوالہ نہیں کہتے

امکان

آزادیٔ افکار کی شمعیں نہ جلاؤ
آرائشِ زنداں کے لئے خون بہاؤ

اظہارِ کرم خوف کے پھولوں سے کیا جائے
روشن رہِ ہستی کو بگولوں سے کیا جائے

آئینِ چمن ظلم و ستم کا ہے نگہباں
انصاف ہے خوش فہمیٔ احساس پہ خنداں

ہر اہلِ ہوس لائقِ انعام و کرم ہے
دانشورو فنکار ثناخوانِ ستم ہے

حب الوطنی جعفر و صادق کی ہے جاگیر
ٹیپو کا لہو بیچنے والوں کی ہے توقیر

زنجیرِ گراں قسمتِ صاحب نظراں ہے
زہراب بکف آج بھی سقراطِ جہاں ہے

۱۷ اکتوبر ۱۹۶۴ء

سلسلہ خوابوں کا

کتنے دلکش ہیں ترے عارض و لب کی یادیں
کس قدر توبہ شکن ہے تری زلفوں کا خیال
کتنا پرکیف تصور ہے تری آنکھوں کا
تاب کس کو ہے جو دیکھے تری قامت کا جمال
تجھ کو ایک پھول کہوں ، چاند کہوں خواب کہوں
ذہن شاعر میں بیک وقت یہ ابھرے ہیں سوال

تیرے چہرے کو سبھی ایک کنول کہتے ہیں
اور ہم تجھ کو سراپائے غزل کہتے ہیں
میرے جذباتِ فراواں میرے زخموں کے نشاں
تیری دزدیدہ نگاہی کا گِلا کرتے ہیں
ہر گھڑی پھول دہکتے ہوئے رخساروں کے
میرے احساس کے گلشن میں کِھلا کرتے ہیں

امکان

کیا بتاؤں تجھے اپنے دلِ بیتاب کا حال
کتنے دیپک میرے سینے میں جلا کرتے ہیں
بے نیازِ غمِ ایام مرے ذہن و نظر
گم سرابِ لب و عارض میں رہا کرتے ہیں
تری آواز کے شعلوں میں سحر جلتی ہے
مسکراہٹ میں تری برقِ تپاں پلتی ہے

لیکن اے جانِ سخن تجھ کو خبر ہے کہ نہیں
میرے کاشانہ۔ غربت پہ نظر ہے کہ نہیں
تو کہ پروردۂ آغوشِ نسیمِ گلشن
جسمِ سیمیں پہ یہ زرتار ترے پیراہن
گرم جھونکوں کی عنایت سے بچیں گے کب تک
خارزارِ غمِ ہستی میں رہیں گے کب تک
مطربِ وقت کہیں چھیڑ نہ دے تلخ غزل
ڈر ہے مسمار نہ ہو جائے یہ نغموں کا محل
جانِ جاں سلسلہ خوابوں کا کہیں ٹوٹ نہ جائے
تیرے ہاتھوں سے کہیں جامِ وفا چھوٹ نہ جائے

اگست ۱۹۶۳ء

اعتراض

کچھ لوگ معترض ہیں کہ ہم ان کی بزم میں
بےاذنِ سازِ زیست پہ کیوں نغمہ خواں ہوئے
کیوں گنگنائے گیت نویدِ بہار کے
کیوں درپئے شکستِ سکوتِ خزاں ہوئے
کیوں منحرف جبیں ہے درِ اقتدار سے
کیوں فکر و آگہی کے دیئے ضوفشاں ہوئے
اس میکدے میں ہونے لگی تشنگی کی بات
ماحولِ خوشگوار میں یہ گمرہی کی بات

امکان

کس درجہ پرسکوں تھی فضا گرد و پیش کی
صحن چمن تھا شہر خموشاں بنا ہوا
تھے بے نیازِ سود و زیاں میکدے کے لوگ
ساقی تھا ایک پیکرِ ایماں بنا ہوا
چون و چرا کے لفظ سے ناآشنا تھے لب
دانش کدہ تھا کوچہء جاناں بنا ہوا
کس نے جلا دیئے یہ چراغ شعورِ زیست
ہر شاخ گل ہے سروِ چراغاں بنا ہوا
افتادگان خاک کو بیدار کر دیا
بدنام ہم نے حسن شبِ تار کر دیا

-۱۹۶۲

کس پری چہرہ سے ہم عشق جتانے نکلے
سب رقیبوں کو پتہ اس کا بتانے نکلے

وضعِ داری پہ کوئی حرف نہ آنے پائے
نقدِ جاں پھر سرِ بازار لٹانے نکلے

بارہا ہم پہ جہاں سنگِ ملامت برسے
پھر اسی کوچے میں آواز لگانے نکلے

سرخرو کوئی تو راون کے مقابل ٹھہرے
آگ دامن میں لئے آگ بجھانے نکلے

ہر قدم راہ میں روشن تھی انا کی مشعل
اک دیا ہم بھی سرِ راہ جلانے نکلے

امکان

سرد مہری اس کی کچھ لمحوں کی کیا کیا کر گئی
چاندنی میں دھوپ کا احساس پیدا کر گئی

زہر کے پودے اگے ہیں خوف کے سائے تلے
فصلِ گل اس بار بھی وقفِ تماشا کر گئی

کوئے جاناں سے کوئی گذرا تھا کل شب سرخرو
خامشی مقتل کی ، کتنے راز افشا کر گئی

شوخیٔ رنگِ حنا کی گفتگو اس بزم میں
مرحلے درپیش کیا کیا ہیں ، اشارا کر گئی

انجمن کی خیر اہلِ انجمن کی خیر ہو
جاتے جاتے نذرِ جاں کا شب تقاضا کر گئی .

یوم مئی

حیاتِ شعلۂ تابندہ و درخشندہ
وجودِ ظلم کو خاکِ عدم بنا دے گی
وقار و سطوتِ دار رسن کی خیر مناؤ
بنائے قصرِ ستم زندگی ہلا دے گی
روایت و روشِ جور عمر کھو بیٹھی
خود اپنی آگ کے دریا میں ہاتھ دھو بیٹھی

امکان

فریب و جبر کے محلوں کے پاسبانوں کو
پیامِ شہرِ خموشاں ہے خونِ جنسِ وفا
حیاتِ وقت کے آتش فشاں پہاڑوں سے
نظامِ زر کی فیصلوں کو دے رہی ہے صدا
ضمیرِ نوعِ بشر مضطرب ہے دل کی طرح
بھڑک اٹھا ہے کسی جذبِ مشتعل کی طرح

ہر ایک قطرۂ خوں زندگی کا سرچشمہ
علم بلند ہے مظلوم آدمیت کا
عظیم بات ہے زنداں میں زہرِ غم پینا
عظیم تر ہے صلیبوں کی چھاؤں میں جینا
شکستِ جھوٹ کی منزل شکستِ قسمتِ جہل
شکستِ غم کا مقدر شکستِ دکھ کا نصیب
پہنچ چکا ہے بدستِ نوازشِ حالات
تضادِ فطرتِ سرمایہ خودکشی کے قریب

کرن لہو کی نئی صبح کا حوالہ ہے
اب اس کے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

مئی ۱۹۶۶ء

ہم لوگ

ہمیں ہیں فوجِ تشدد ، ہمیں ہیں لشکرِ غم
بنائے ظلم ہمیں ہیں ہمیں سپاہِ ستم

ہمیں غلام ہمیں پاسباں غلامی کے
ہیں اپنے تیرِ کرم کا شکار صدیوں سے

شکستِ اہلِ محبت پہ آہ بھرتے رہے
مگر ہوس کے اشاروں پہ رقص کرتے رہے

امکان

ہمارے ہاتھوں ہی تعمیر قصر جبر ہوئے
ہم اپنی سادہ دلی سے قتیل صبر ہوئے

ہمیں بڑھاتے رہے حوصلے یزیدوں کے
ہمیں صلیب سجاتے رہے مسیحوں سے

نظامِ زر کے فریبوں کا زہر پیتے رہے
لہو کے تاروں سے دامن کا چاک سیتے رہے

یہ چند لوگ خدائی ہے جن کی دھرتی پر
یہ لوگ اہرمنِ وقت ہیں علامتِ شر

یہ لوگ رحمتِ یزداں کا شاہکار نہیں
اب ان کو جنتِ ارضی کا اعتبار نہیں

ستم کو جہل کو تقدیرِ آدمی نہ کہو
ستونِ دار کو آغوشِ زندگی نہ کہو

شعور جاگ اٹھا ہے ضمیر جاگ اٹھا
طلسمِ ہوش ربا کا اسیر جاگ اٹھا

۱۹۶۷ء

جبرِ حالات

تیری مشروط توجہ مری پابندِ نظر
جبرِ حالات کا احساس جگا دیتی ہیں
چشمِ بیدار کا ہر خواب سلا دیتی ہیں
چاند سورج میری آنکھوں کے بجھا دیتی ہیں

باھمہ غم بہمہ لذتِ آزارِ ستم
دیکھنا ٹھہرا مجھے آرزوئے وصل کا خوں
شخصیت کا تیری جادو کہ محبت کا فسوں
بارہا چاہوں مگر ترکِ تمنا نہ کروں

زندگی وقت کے چہرے پہ لہو ملتی ہے
جبرِ حالات کی ظلمت میں سحر پلتی ہے

درد کا پڑاؤ

جہاں کرب سمیٹے میں اپنی آنکھوں میں
مشاہدہ جو فصیلِ نظر کا اس کی کروں
مشاہدات فصیلِ نظر میں کھو جاؤں
گھنیری چھاؤں میں پلکوں کی اس کی سو جاؤں

پسِ فصیلِ نظر میں جو جھانکنا چاہوں
قطارِ قوسِ قزح درمیان آجائے
حواسِ خمسہ پہ سحرِ جمال چھا جائے

پسِ فصیلِ نظر کیا ہے کیا پتہ مجھ کو
پڑاؤ قافلہ۔ درد کا وہاں بھی نہ ہو
شکست و ریخت سے دو چار اک جہاں ہی نہ ہو

شاد شمیم

میں اس کو سوچوں تو چھٹ جائیں دکھوں کے بادل
میں اس کو سوچوں تو کھل جائیں سکھوں کے آنچل
قریہ جاں سے اندھیروں کا سفر ہو جائے
مطلعِ فکر پہ مہتاب سا چہرہ جاگے
افقِ ذہن پہ سورج کا اجالا جاگے
لبِ گویا پہ مسرت کی کرن پھوٹ پڑے
رگِ احساس میں الفت کی کرن پھوٹ پڑے
خود اپنے آپ سے چاہت کی کرن پھوٹ پڑے

امکان

میں اس کو دیکھوں تو تصویر زندگی نکھرے
میں اس کو دیکھوں تو تحریر شاعری مہکے
وہ پھول ، پھول کنول کا ، وہ موتیے کا پھول
وہ پھول میری تمناؤں کا حسین تر پھول
وہ مسکرائے تو رنگِ گلاب برسائے
ہنسے تو اس کا سراپا دھنک میں ڈھل جائے
وہ قہقہوں سے فضائے سحر کو مہکائے
وہ میری سانسوں میں خوشبوئے آرزو بن جائے

وہ میرا چاند ، محبت کا ، چودھویں کا چاند
یوں ہی ہمیشہ دمکتا رہے وہ خواب سا چاند

(ہماری روسی نژاد بہو الیسنا مرحومہ کی نشانی جو یکم نومبر ۱۹۹۳ء کو پیدا ہوا۔)

نذرِ جوش

عظیم ورثۂ تہذیب
بحرِ بے پایاں
سخن تمام شعورِ حیات کی مشعل
حدیثِ دیدہ وری آبروئے لوح و قلم
فن اس کا عہد کی سچائیوں کا آئینہ
متاعِ عظمتِ انسانیت
متاعِ ہنر

امکان

سمندروں کا تموج سمیٹے سینے میں
اک آبشار، تخیل کی وادیوں میں رواں
وہ اضطراب سراپا
وہ پیکرِ سیماب
وہ ایک سلسلہ۔ کوہسارِ بینائی
رموزِ عشق کا وہ رازداں
وفا کا امین
طلسم خانہ۔ دل کا مکین با تمکین
جمال فکر کا وہ آفتاب عالمتاب
سفیر صبح تمنا
رقیب تیرہ شبی
وہ انقلاب۔ جہاں کا نقیب خوش آہنگ
حریف جبر و ستم حرف و صوت کی توقیر
وہ صلح کل کا پیمبر
محبتوں کی کتاب
دیارِ حسن کی تنویر عشق کی تفسیر
عظیم ورثہ۔ تہذیب
بحرِ بے پایاں۔

دوہے

تو مندر میں ایک پجاری تیری پوجا میرا جیون
تیرے دوار پہ بھینٹ چڑھا دوں تن من دھن یہ نیل گگن

من گنگا میں تیر رہا ہے روپ کنول مکھڑا تیرا
اپنی پریت کا مان ہے اتنا سن لے بس دکھڑا میرا

پریم کا ناتے نرمل جل ہے نرمل جل ہے پریم کا ناتہ
اس نرمل جل میں تن دھو لیں کیسا دکھ کیسی چنتا

تو داتا میں ایک سوالی سندرتا کی بھکشا دے دے
گیان کے موتی ۔ دھیان کی جیوتی بدلے میں سب کچھ لے لے

پیار کا بندھن ہردے بندھن ، ہردے کا اجیارا بندھن
تیری پریت سے کویتا رانی سورگ بنا ہے دل کا آنگن

تجھ میں میں رادھا کو دیکھوں ۔ تجھ میں میں سیتا پاؤں
متھرا کی گلیوں میں بھٹکوں ۔ ڈھونڈنے میں لنکا جاؤں

اپریل ۱۹۹۲ء

فیض احمد فیض

وہ انقلاب کا مطرب

نئی رتوں کا مغنی ، نئی سحر کا نقیب
بجھے دلوں کا مسیحا ، وہ تیرگی کا رقیب
وہ اپنے عہد کا کیوپڈ ، وہ دیوتا فن کا
وہ سومنات 'محبت' کا 'بت شکن کتنے
ہدف بنا کے چلے اور خود ہدف ٹھہرے
وہ اپنے عہد کا گوتم
وہ صلحِ کل کا سمندر ، وہ آشتی کا جہاں
دکھوں کی کاہکشائیں سجائے آنکھوں میں
رہِ نجات کی مشعل جلائے آنکھوں میں
لبوں پہ خندۂ گل کی کرن دمکتی ہوئی
نظر سلگتی ہوئی

امکان

دیئے جلائے ہوئے گیان کے، دھیان کے دیپ
شعور زیست کا وہ رہ گذر اجال گیا
ڈگر پہ فکر کی سورج نیا اچھال گیا
دیار حسن کا محرم
وہ سحر ساز سراپا وہ شخصیت کا جمال
کسی خیال کا پیکر، کسی صنم کا خیال
ہے قحط لفظ و معانی کا مرحلہ درپیش
قلم کو ردِ روانی کا مسئلہ درپیش
طلسم دیدہ بیدار کہہ نہیں سکتا
وہ انقلاب کا مطرب
نئی رتوں کا مغنی نئی سحر کا نقیب
جناب فیض متاعِ حیات و حرف و ہنر
"زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے"

۷ ستمبر ۱۹۹۴ء

حرفِ مکرر

اب اندھیرے میں سفر قافلہ شوق کا ہے
گرد آلود بہت خلوتِ جاں کی ہے فضا

آج کی شام تری یاد کے گوشے جاگے
جیسے خاموش سمندر میں تلاطم ہو بپا

شورش درد بڑھی کرب کا طوفاں اٹھا
دل کی بستی پہ کوئی کوہِ گراں ٹوٹ پڑا
خشک آنکھیں تھیں زمانے سے، شفق رنگ ہوئیں
دل کے صحرا میں کوئی چشمۂ خوں پھوٹ پڑا

تو تھا رنجیدہ تو تھی ساری فضا رنج آلود
تیرے خوش ہونے سے ایک عالم سرشاری ہے
شب گزیدہ لب و رخسار دمک اٹھے ہیں
زندگی کلیۃً حالتِ بیداری ہے

تو مرے سلسلۂ زیست کی ہے اگلی کڑی
تیری تابندہ جبیں پر میں ستارہ ابھروں
تجھ میں ابھرا ہوں پھر اک بار تو یہ چاہت ہے
وقت کی لوح پہ میں حرفِ مکرر ٹھہروں

(بیرون ملک زیر تعلیم اپنے بیٹے خالد شمیم کے حوالہ سے۔)

بھیگا ہوا جنگل

بہت برسے ہیں بادل اب کے ساون کے مہینے میں
مگر کھیتوں میں من کے اپنے ، ہریالی نہیں آئی
جلو میں فصل باراں اپنے ، سرشاری نہیں لائی
صبا مدت سے پھولوں کی خبر لینے نہیں آئی
نظر میں برگ ہائے زرد کا موسم نہیں بدلا
ہمارے شہر جاں میں درد کا موسم نہیں بدلا

امکان

گذرتے ہیں کچھ اس انداز سے اب روز و شب اپنے
کوئی سایہ پسِ سایہ چلے آہستہ آہستہ

عدم آباد کی جانب بڑھے آہستہ آہستہ
کوئی بھیگا ہوا جنگل جلے آہستہ آہستہ

زمیں نم ہے فضا نم ہے مگر جلوے سلگتے ہیں
جھلستی ہے فصیلِ فکر و فن ، سپنے سلگتے ہیں

رگوں میں انجمادِ خوں کا کچھ احساس سا اٹھے
کبھی اپنا سراپا خوف کے پیکر میں ڈھل جائے

ردائے آتشیں اوڑھے کوئی سایہ نظر آئے
کوئی آسیب جیسے گھر کے آنگن میں اتر آئے

یہ شہر آرزو آتش نفس صحرا نہ بن جائے
یہ خوابوں کا جزیرہ خون کا دریا نہ بن جائے

۳۰-۸-۹۴

سبطے بھائی

انتشارِ نظر کا چارہ گر
حسن تھا ، حسن بار تھا وہ شخص
اس کی چھاؤں میں سکھ کی ٹھنڈک تھی
شجرِ سایہ دار تھا وہ شخص

رشتۂ درد کا وہ سر چشمہ
تپتے صحرا میں سائبان تھا وہ
کہکشائیں خلوص کی اوڑھے
پیار کا ایک آسمان تھا وہ

امکان

زندگی جس سے اکتساب کرے
ارتقا کی کتاب چھوڑ گیا
عشق کے جامعہ کا شیخ العلم
آگہی کا نصاب چھوڑ گیا

اپنے خونِ جگر کی کرنوں سے
فکر کے راستے اجال گیا
دشتِ شب میں بھٹکنے والوں کو
روشنی کے سفر پہ ڈال گیا

صورتِ نور، صبحِ ہستی کے
رخ پہ گردِ ملال چھوڑ گیا
روشنی کا سفیر روشن تر
نقشہائے خیال چھوڑ گیا

جو ہم پہ گذری

لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی تھی
باغباں نے گل خنداں کی قسم کھائی تھی
اک نئے دور کے آغاز کا دلکش نغمہ
گنگنائی تھی زباں وقت کی مبہم دھن میں
لوگ کہتے ہیں کہ اک صبح طرب آئی تھی
اپنی آغوش میں فردا کا فسوں لائی تھی

امکان

لوگ کہتے تھے کہ اب میکدۂ ہستی میں
کوئی شاکی نہ رہے گا کسی مستانے سے
تشنہ کامی کی شکایت نہ کرے گا کوئی
یوں بدل جائے گا میخانے کا دستورِ کہن
اب تہی جام و سبو کی نہ حکایت ہو گی
نغمہ زن قسمتِ اربابِ محبت ہو گی

لوگ کہتے ہیں کہ تزئینِ چمن ہو بھی چکی
رسمِ آرائشِ رخسار و دہن ہو بھی چکی
شانہ در گیسوئے لیلائے وطن ہو بھی چکا
دستِ امروز سے ماضی کا کفن سل بھی چکا
قافلے منزلِ مقصود کو جا پہنچے ہیں
مرحلے قربِ لبِ یار کے آ پہنچے ہیں

زندگی پھر بھی پریشاں سی نظر آتی ہے
عظمتِ حسن پشیماں سی نظر آتی ہے
دیکھ کر خلوتِ ہستی کی خموشی یارو
موت انگشت بہ دنداں سی نظر آتی ہے
شدتِ درد کا احساس سوا ہے اب بھی
شمعِ غم اور فروزاں سی نظر آتی ہے

امکان

غازۂ گل لئے رخسارِ خزاں آج بھی ہے
عندلیبوں کا وہی طرزِ فغاں آج بھی ہے
شمع بےنورِ یقیں تا بہ سحر جلتی ہے
زیست شرمندۂ صاحب نظراں آج بھی ہے
ذہنِ مشرق پہ وہی خوابِ گراں آج بھی ہے
چشمِ مغرب بہ حقارت نگراں آج بھی ہے

آج تو وہ بھی پشیماں سے نظر آتے ہیں
جن کے کانوں نے نئے دور کے نغمات سنے
جن کی آنکھوں نے نئی صبح کے جلوے دیکھے
جن کے ہونٹوں پہ گہربار تبسم مچلے
یہ فریبِ رہِ مبہم کی شکستہ دیوار
کب تلک قصر تقدس کو سہارا دے گی
یہ طلسمِ شبِ بیمار رہے گا کب تک
خوں فشاں دیدۂ بیدار رہے گا کب تک

۵ مئی ۱۹۶۲ء

○

کس نام سے پکار رہی ہے صبا اسے
چشمِ حیا سمجھتی ہے جانِ حیا اسے

پھولوں کے کس قبیلے میں اس کا شمار ہے
کیا بات کہہ گئی ہے چمن کی ہوا اسے

دیوی وہ شاعری کی مرے من میں بس گئی
موضوعِ شعر بننا کچھ اچھا لگا اسے

اپنی قبائے جاں ہے سو وہ تار تار ہے
وہ گل نما ہے پیش کروں کیا ردا اسے

روشن رہے وہ چہرہ ہمیشہ کنول صفت
یا رب لگے ہماری نظر کی دعا اسے

جنوری ۱۹۹۲ء

جیئے سندھ

عظیم سندھ، تری عظمتِ دیرینہ کی خیر
تری زمیں کو سلام
ترے آسماں کو سلام
سلام تیری فضاؤں کو جس میں بوئے وفا
رچی بسی ہے صبا و شمیم گُل کی طرح
محبتوں کا چمن سندھ، تیرا دامنِ دل

امکان

کشادہ تر ہے کسی بحرِ بیکراں کی طرح
تو ماروی کا وطن روحِ ماروی کی طرح
جمالِ حریتِ فکر و آگہی کا ایاغ
تو ماروی کی زمیں حسنِ ماروی کی طرح
ہمیشہ تازہ و تابندہ و درخشندہ
تو ماروی کا جہاں عزمِ ماروی کی طرح
ہر ایک جبر و تشدد سے، حرص و خوف سے دور
ہمیشہ زندہ و پایندہ و درخشندہ
عظیم سندھ تری عظمتِ دیرینہ کی خیر
تری زمیں کو سلام
ترے آسماں کو سلام

۱۹۷۰ء

شکستِ خواب

قائم ہوا تھا درد کا رشتہ جگوں کے بعد
رت عاشقی کی آئی تھی کتنی رتوں کے بعد
صدیوں کا کرب تھا رگ و پئے میں بسا ہوا
صدیوں کے کرب کا تھا مداوا نگاہ میں

بارش ہوئی تھی دامنِ صحرا ہوا تھا سبز
کلیاں کھلی تھیں کشتِ تمنا میں بے شمار
دامانِ آرزو سبدِ گل فروش تھا
فصلیں کھڑی تھیں خوابوں کی حدِ نظر تلک
رقصاں تھا کوہِ قاف کی پریوں کا طائفہ

امکان

کیوپڈ زمیں پر اترا تھا تیر و کماں لئے
لیلیٰ تلاشِ قیس میں نکلی تھی نجد میں
راوی کی موجیں مضطرب و بے قرار تھیں
رانجھا کو اپنی ہیر کا پھر انتظار تھا
آنکھوں میں انبساط کی گنگا لئے ہوئے
سیتا ملی تھی رام کے ہاتھوں میں ہاتھ تھا
جمنا ندی کی لہروں میں کچھ ارتعاش تھا
رادھا تھی اور کرشن کنھیا کا ساتھ تھا

لو داغہائے دل کی ابھی تک بجھی نہ تھی
زخموں کے اندمال کا تھا مرحلہ ابھی
آغازِ التفات کا تھا سلسلہ ابھی
آنکھیں کھلیں تو جاں کی فضائیں بدل گئیں
دنیائے فکر و فن کی ہوائیں بدل گئیں
موسم محبتوں کا بڑا مختصر رہا
تعبیرِ خوابِ وصل کا دل منتظر رہا

۲۰ دسمبر ۱۹۹۱ء

صبا اکبر آبادی

مشاطگیٔ گیسوئے فن مدتوں ہوئی
آرائشِ عروسِ سخن مدتوں ہوئی
دستِ صبا فضائے ادب پر رہا محیط
تہذیبِ ساکنانِ چمن مدتوں ہوئی
تزئینِ بوستانِ وطن مدتوں ہوئی

امکان

اصنافِ شاعری نظر آتی ہیں بے اساس
فنِ رباعیات بھی ہے آج حرفِ یاس
اب مرثیہ بھی مرثیہ خوانی کیا کرے
حضرت صبا کی یاد میں ہے انجمن اداس
دوشیزۂ غزل کو ہے حدِ ادب کا پاس

اب تیز تر ہے دھوپ کوئی سائباں نہیں
جائیں کہاں طیور کوئی آشیاں نہیں
رک کر ملے پناہ بجھے تشنگی جہاں
رستے میں اپنے اب کوئی ایسا مکاں نہیں
شہرِ صبا میں اب کوئی پیرِ مغاں نہیں

نومبر ۱۹۹۱ء

خوابوں کی وادی

چھاؤں کی جگہ راہ میں ہیں خوف کے سائے
پیڑوں کی ہری شاخوں سے لپٹے ہیں بگولے

ہیں دام فضاؤں میں بھی شاید کہ طیور آج
بیٹھے ہیں نشیمن میں پر و بال سمیٹے

سچل کی زمیں ، شاہ کے خوابوں کی یہ وادی
اگ آئے ہیں ہر سمت یہاں زہر کے پودے

امکان

ہر چند چراغوں کی جگہ بلب ہیں روشن
تاحدِ نظر آج بھی غالب ہیں اندھیرے

پھولوں سے محبت کے کبھی سجتی تھیں صبحیں
اب آگ میں نفرت کی جھلستے ہیں سویرے

کب کرب سے آزاد ہوں، آلام سے چھوٹیں
ہم جبر مسلسل میں گرفتار ہیں کب سے

دکھ درد کے موسم کا تسلسل کبھی ٹوٹے
کچھ دیر بہاروں کا یہاں قافلہ ٹھہرے

صدیوں سے بجھی آنکھوں میں جھانکیں نئے سپنے
چہروں پہ کرن، ہونٹوں پہ نغمہ کوئی مچلے

تاریک گھروں کا بھی مقدر کبھی جاگے
یا رب نئے دن کا نیا سورج یہاں چمکے

اگست ۱۹۹۱ء

داغ پسِ داغ

شاخِ سرسبز جو کاٹی گئی کس باغ کی تھی
کس گلستاں کے شجر سوکھ رہے ہیں دیکھو
بے ردا پیڑ قطاروں میں کھڑے ہیں دیکھو
کوئی سایہ ہٹیں سایہ ہے تو دکھ کا سایہ
راہ میں مسلے ہوئے پھول پڑے ہیں دیکھو
جا بہ جا زخم زمینوں پہ اگے ہیں دیکھو
داغ ہی داغ جبینوں پہ سجے ہیں دیکھو

امکان

خوں بہا کس سے طلب کیجئے اپنے خوں کا
شک کا اظہار کریں کس پہ عدو کس کو کہیں
کس پہ الزام دھریں کس پہ اٹھائیں انگلی
آستیں اپنی ، لہو اپنا ہے خنجر اپنا
کس کے ہاتھوں پہ نشاں قتل کا اپنے ڈھونڈیں
نیند آجائے تو یارو نئے سپنے ڈھونڈیں

جنوری ۱۹۹۰ء

اجمل خٹک۔ سفیرِ صلح و محبت

سفیرِ صلح و محبت ، اسیرِ زلفِ سخن
فضائے شعر میں پھیلی ہے بوئے ارضِ وطن
وہ ماہتاب کہ روشن ہے جس سے جادۂ فن

صلیبِ وقت کی چھاؤں میں زندگی کا سفر
شکست و ریخت کی راہوں میں آگہی کا سفر
کس اعتماد سے جاری ہے روشنی کا سفر

امکان

غبارِ ہجر بھی ہے گردِ ماہ و سال بھی ہے
دکھوں کے دیپ بھی ہیں مشعلِ خیال بھی ہے
جبینِ شوق پہ عکسِ رخِ جمال بھی ہے

عزیز کوئے ملامت کی بات ٹھہری ہے
رفاقتِ شبِ غم کشفِ ذات ٹھہری ہے
متاعِ درد، متاعِ حیات ٹھہری ہے

وید امن سنانے میں ساری عمر کٹی
لہو سے آگ بجھانے میں ساری عمر کٹی
یقیں کی شمع جلانے میں ساری عمر کٹی

پیامِ صلح و محبت کی پاسداری ہو
ہمیشہ کشتِ تمنا کی آبیاری ہو

ستمبر ۱۹۹۱ء

صادقین

"انگلیاں فگار اس کی ۔ خامہ خوں چکاں اس کا"
حسن نور کی صورت آسمان سے اترے
حرف روشنی ٹھہرے
بحرِ بیکراں غم کا بس گیا رگ و پے میں
درد پیکر شب میں، کہکشاں تصور میں
نقش بن کے ابھرے ہیں صفحۂ تخیل پر
صفحۂ تخیل پر خون دل کی تحریریں
خون دل سے ابھری ہیں فکر و فن کی تصویریں
"انگلیاں فگار اس کی خامہ خوں چکاں اس کا"

امکان

عرش کے مکینوں میں گفتگو قلم کی ہے
تذکرہ جنوں کا ہے
ذکر رنگِ خوں کا ہے
عرش کی فضاؤں میں غلغلہ سخن کا ہے
مہر و ماہ گردش میں، مہر و ماہ دامن میں
مہر و ماہ آنکھوں میں اس کی جگمگاتے ہیں
خواب چشمِ بینا کا، خواب چشمِ حیرت کا
خواب اس نے دیکھے بھی خواب اس نے بانٹے بھی
خواب خوبصورت خواب آگہی کی رفعت کا
خوب تر سفر کا خواب
خوب تر جہاں کا خواب
حسن خوب تر کا خواب
نقشہائے رنگا رنگ
روشنائی اشکوں کی مشعلوں کی لو بن کر
چہرۂ محبت کو تابناک کرتی ہے
زندگی کی راہوں میں روشنی کی محرابیں
"انگلیاں فگار اس کی - خامہ خوں چکاں اس کا"
شاعری کا سرمایہ فکر و فن کا سر چشمہ
نوکِ خامہ سے اس کی چاندنی ٹپکتی ہے
•

امکان

روشنی نکھرتی ہے۔ تیرگی سمٹتی ہے
خامہ خوں چکاں اس کا اک جہانِ معنی ہے
انگلیاں فگار اس کی
خیر و شر کی دنیا میں خیر کی علامت ہیں
انگلیاں فگار اس کی روشنی کی قندیلیں
کرب کی ہیں تصویریں
جبر کی نفی جن سے جہل کی نفی جن سے
کفر کی نفی جن سے صبح و شام ہوتی ہے
وہ سفیرِ دانائی وہ نقیبِ بینائی
خامہ خوں چکاں اس کا حسن کا مصور ہے
عشق کا مسافر ہے
زیست کی صداقت کا وہ امین و پیغمبر
وہ صحیفۂ غم کا معتبر مصنف ہے
"انگلیاں فگار اس کی خامہ خوں چکاں اس کا"

۲۹-۲-۹۲

کہکشاں

یہ موسم درد کا یا نشے کا ہے
فزوں تر ہے کشش کوئے بتاں کی
چبھن کانٹوں کی ٹھوکر پتھروں کی
خلش غم کی نہ یاد اب زخم جاں کی
بچھا دی ہے تیری چاہت نے گویا
مری راہوں میں چادر کہکشاں کی

فروری ۱۹۹۲ء

خواب

خواب فن کا سرمایہ، خواب فن کی پونجی ہے
خواب مجھ سے مت چھینو
خواب دیکھنے دو مجھے خواب بانٹنے دو مجھے
کفر رد کیا میں نے روشنی کو دیں جانا
اہر من کے بیٹوں کو میں نے اہر من جانا
ان کو سرنگوں دیکھا بارگاہِ یزداں میں

امکان

آفتاب دامن میں ماہتاب جیبوں میں
میں نے بھر لئے کتنے
تیرگی مٹانے کو زندگی کی راہوں سے
مانگ میں نے دھرتی کی رنگ و نور سے بھر دی
کہکشاں کی چادر سے ڈھک دیا بدن اس کا
چار سو دھنک پھوٹی چار سو شفق پھولی

آفتاب دامن میں
ماہتاب جیبوں میں میری جگمگانے دو
خواب میری پونجی ہے خواب میرا سرمایہ
خواب مجھ سے مت چھینو
خواب مجھ سے مت چھینو

۱۹۹۲ء

سجدِ تنہائی

یاد تنہائی کی ساتھی بھی ہے بینائی بھی
جب بھی تنہائی ملے یاد کی مشعل جل جائے
قریہ، جاں میں ہر اک سمت اجالا ہو جائے
فکر و احساس کا پیکر رگ و پئے میں جاگے
درد کی کرب کی تصویر بنے اور مٹے
چہرۂ وقت کی قندیل جلے اور بجھے

سارے لمحے جو اثاثہ ہیں متاعِ جاں ہیں
عرصۂ شوق میں معلوم سفر کے لمحے
بارہا کوئے ملامت میں سفر کے لمحے
جب بھی چاہوں وہ قطاروں میں کھڑے ہو جائیں
جب بھی چاہوں وہ اشاروں کی زباں بن جائیں

امکان

گوشۂ جاں میں سجائے تھے جو سورج اور چاند
بجھ گئے ہیں وہ اگر آج تو کب بجھ پائے
میری آنکھوں میں میرے خوابوں کی پہنائی میں
روشنی ہے اسی سورج کی اسی چاند کی ضو
وادیٔ زیست کی پرخار گزرگاہوں میں
پھوٹتی رہتی ہے ہر لمحہ نئی صبح کی پو

دل کے آنگن میں بھی اک چاند کبھی اترا تھا
چاند کے من میں اترنے کے مراحل کا سفر
لمحہ لمحہ میری پلکوں پہ سجا رہتا ہے
میرے سپنوں کا نگر میرے تمناؤں کا شہر
بقعۂ نور شب و روز بنا رہتا ہے

کربِ احساس وہی ، لذتِ آزار وہی
ہجر کی رات وہی ، دیدۂ بیدار وہی
عشق کا طور وہی ، حسن کا انداز وہی
نجدِ تنہائی وہی ، قیس کی آواز وہی
یاد تنہائی کی ساتھی بھی ہے بینائی بھی

مارچ ۱۹۹۲ء

حبیب جالب

ضمیرِ وقت کی آواز ! روحِ عصر کا کرب
سمیٹے دامنِ دل میں نہ جانے کب سے تھا
حصارِ جبر و ستم میں دکھوں کی بستی میں
جلائے شمعِ قلم ہمکلام شب سے تھا

حریفِ سنتِ آذر ، کلیم جادۂ فن
صنم کدہ میں مخاطب بتوں کے رب سے تھا
وہ اپنے عہد کا منصور حرفِ حق کا نقیب
صلیبِ وقت پہ فائز وہ شخص کب سے تھا

امکان

وہ لب جو حرفِ سردار کا مغنی تھا
جو نغمہ خواں سرِ مقتل رہا اجالوں کا
ہو نظم یا کہ غزل مختلف وہ سب سے تھا
کمال پیار اسے منصبِ ادب سے تھا

وہ ایک شخص جسے جانِ فکر و فن کہیئے
جمالِ دیدہ وری حرمتِ سخن کہیئے
وہ ایک شخص جسے مشعلِ نوا کہیئے
وہ ایک شخص جسے نور کا عصا کہیئے

جلائے شمع قلم ، ہمکلام شب سے تھا
صلیبِ وقت پہ فائز وہ شخص کب سے تھا

۱۴ مارچ ۱۹۹۳ء

تر ا ذکر مشغلہ ہے تری گفتگو خوشی ہے
تری یاد آرزو ہے ترا پیار زندگی ہے

ترے عارض و جبیں ہیں کہ مری غزل کے مطلعے
ترا زیرِ لب تبسم ، مری جان شاعری ہے

تری جنبشِ نظر میں مئے خوشگوار رقصاں
ترے گیسوؤں کے سائے میں بہار سو رہی ہے

امکان

وہ اداس ہو گئے ہیں تو صبا سلگ اٹھی ہے
کبھی مسکرا دیئے ہیں تو سحر سنور گئی ہے

وہ سنبھل کے چل رہے ہیں، ہے خیال میرے دل کا
یہ شعورِ نازکی ہے کہ جمالِ سادگی ہے

ہیں متاعِ جاں لٹا کر بھی شمیم مطمئن سے
یہ شعارِ عاشقی ہے کہ طلسمِ بے خودی ہے

۱۹۶۳ء

آپ بندہ نواز

کیا جان بتاؤں جو میری جاں پہ بنی ہے
پیوست کوئی سینے میں نیزے کی انی ہے
یہ شہر جو تھا شہر نگاراں تیرے ہوتے
تھے کوچہ و بازار گلستاں تیرے ہوتے
منظر ہے اسی شہر میں وحشت زدگی کا
ہر گام پہ احساس اگے تیری کمی کا
تجھ بن یہ نگر اجنبی رستوں کا نگر ہے
ہر سائے سے محروم مرے پیار کا گھر ہے

امکان

ہر لمحہ تیری یاد چبھن ہے مرے من میں
دل کوئی تھکا ماندہ مسافر کسی بن میں
ہر آن ہے لو تجھ سے مسیحا سے ہو جیسے
سانسوں کا تعلق لبِ گویا سے ہو جیسے
دریا تو ہے دریا اسے پیاسوں کی خبر کیا
تپتی ہے زمیں دل کی جھلستی ہے نظر کیا

۸-۳-۱۹۹۲ء

سراپا

دامانِ گل قبائے صبا ، چہرۂ سحر
ہیں مستعار جس سے یہ سارے تصورات
وہ شخص میرے من کا میرے ذہن کا جمال
وہ شخص میری جانِ غزل ، جانِ فکر و فن

شعروں میں اس کے حسن کی تہہ داریوں کا عکس
ہر گوشۂ نگاہ دھنک رنگ اک جہاں
جیسے شفق فضائے سخن پر محیط ہو
جیسے کرن ابھرتے ہوئے ماہتاب کی

دامن میں حرف حرف ہے صہبا لئے ہوئے
خوشبو کا روشنی کا سراپا لئے ہوئے

۱۴-۴-۱۹۹۲ء

شعلے برس رہے ہیں لبِ جوئبار سے
ہے مختلف بہار یہ کتنی بہار سے

زنداں کی تیرگی ہو کہ مقتل کی خامشی
ہیں مطمئن کسی نہ کسی اعتبار سے

کیسے کہیں کہ بارشِ خوں کی امید تھی
سائے تو مختلف نہ تھے ابرِ بہار سے

ان کی جبیں پہ شبنمِ احساسِ دلبری
تشبیہ دیجیئے گہرِ تابدار سے

اس جانِ شعر و فن سے شمیم آج گفتگو
آغاز کیجیئے غزلِ خوشگوار سے

۱۹۶۹ء

اک پیڑ سرِ دشتِ تمنا نظر آیا
تا حدِ گماں ابر کا سایہ نظر آیا

تاریک سمندر میں جزیرہ تھا کوئی دل
سورج کسی گوشے سے ابھرتا نظر آیا

بنجر تھی زمیں جذبہ و احساس کی کب سے
صحرا میں ابلتا ہوا چشمہ نظر آیا

جنگل میں بھٹکتا وہ مسافر تھا کہ جس کو
پربت پہ محبت کا شوالہ نظر آیا

ہیں کب سے سرابوں کے تعاقب میں شمیم آپ
اک سروِ رواں آپ کو کیا کیا نظر آیا

امکان

زمانہ بیت گیا شعر گنگنائے ہوئے
ہجومِ شوق میں ان کو غزل سنائے ہوئے

وہ آرہے ہیں مداوائے دردِ دل کرنے
ندامتوں کے جِلو میں نظر جھکائے ہوئے

شکست خوردگیٔ حسن بھی قیامت ہے
وہ اپنی پلکوں پہ ہیں کہکشاں سجائے ہوئے

بھٹک رہے ہیں غمِ زندگی کی راہوں میں
سروں پہ اہلِ زمیں آسماں اٹھائے ہوئے

بصد خلوص و محبت پہنچ گئے ہیں شمیم
کسی کی بزم میں ہم شمعِ دل جلائے ہوئے

۱۹۶۶ء

○

جنگل کو اپنے شہر کی تقدیر جانیئے
اب روشنی کی بھیک اندھیروں سے مانگیئے

حرفوں کے تیر سینۂ فن میں اتاریئے
زخمِ ہنر جبینِ سخن پر سجائیے

ہے پیرہن تمام جنوں کی گرفت میں
دامن بچائیے کہ گریباں بچائیے

اندھے کنوؤں سے کیجیئے سیراب کشتِ دل
ریگِ رواں پہ پیار کے پودے اگائیے

اس شہر آرزو کی فصلیں بھی ہیں اداس
کس خوش نظر کی راہ میں آنکھیں بچھائیے

مکالمہ

آئینے اور چہرے کا سن کر مکالمہ
منظر کوئی بھی منظر حیرت نہیں رہا
ہونٹوں پہ کوئی حرفِ شکایت نہیں رہا
دل کو خیالِ داغِ ندامت نہیں رہا
شوقِ طوافِ کوئے ملامت نہیں رہا
کربِ دروں کا شور اب ان مرحلوں میں ہے
سڑکوں کا شور بارِ سماعت نہیں رہا

مارچ ۱۹۹۱ء

فزوں ہو رسمِ بہاراں شجر کو قتل کرو
چمن کے نام گلِ تازہ تر کو قتل کرو

بچھاؤ دامِ شررِ عہدِ گل کی راہوں میں
صبا کو قید، نسیمِ سحر کو قتل کرو

محبتوں کی علامت کوئی شجر نہ رہے
چمن میں ہر شجرِ باثمر کو قتل کرو

امکان

طلسمِ جہل کی تہذیب کو نظر نہ لگے
ہے حکمِ تازہ فروغِ نظر کو قتل کرو

خرد کو تیرگیٔ کفر کا نقیب کہو
جنوں کی خیر شعورِ بشر کو قتل کرو

گراں فروشیٔ جنسِ ہوس رہے نہ رہے
رموزِ عشق کے ہر باخبر کو قتل کرو

۱۹۸۹ء

افق پر کیسا بادل چھا رہا ہے
اندھیرا روشنی کو کھا رہا ہے

تلاشِ سایہ میں پھر آؤ نکلیں
تناور پیڑ کاٹا جا رہا ہے

یہ موضوعِ سخن ٹھہرا ہے گویا
گھروں کو کون کیونکر ڈھا رہا ہے

امکان

حدیثِ موسمِ گل کیا وہ سمجھیں
جنھیں خوں رنگ منظر بھا رہا ہے

دلِ شاعر دلِ دیوانہ ٹھہرا
ہجومِ شوق میں گھبرا رہا ہے

برس جائے تو دکھ کی گرد بیٹھے
جو ٹکڑا ابر کا منڈلا رہا ہے

۱۹۹۰ء

امکان

○

مستقل
دورِ انتشار رہا
موسمِ
غم پہ اختیار رہا

چمنِ جاں میں اک زمانے تک
اجنبی
سایۂ بہار رہا

سو گئے اہلِ دل شبِ وعدہ
منتظر
حسن کا دیار رہا

امکان

دیکھ کر ریگ زارِ دل اپنا
دیر تک ابر اشکبار رہا

فصلِ گل آئی بھی چلی بھی گئی
سرد گلشن کا کاروبار رہا

گرم بازارِ درد تھا سو وہ ہے
زخم ہی حاصلِ بہار رہا

جذبۂ عشق بھی شمیم اپنا
جبرِ حالات کا شکار رہا

۱۹۹۰ء

نفرت ہے فضا میں تو محبت بھی بہت ہے
جینے کے لئے درد کی دولت بھی بہت ہے

ہے دستِ ستمگر کو اگر فرصتِ آزار
دکھیاروں میں دکھ سہنے کی ہمت بھی بہت ہے

کچھ شمع کہ ہے حسن جہاں سوز کا جادو
پروانوں میں کچھ شوق شہادت بھی بہت ہے

مائل بہ کرم بھی ہوا کرتے ہیں وہ اکثر
تعزیر پسند اپنی طبیعت بھی بہت ہے

ہیں قتل پہ آمادہ ہمہ وقت وہ اس کے
جس کے لئے آنکھوں میں مروت بھی بہت ہے

اب دستِ مسیحا کی کرامات ہیں دو چند
مرہم بھی ہے ، سامانِ جراحت بھی بہت ہے

۱۹۹۰ء

کون ہے وہ اور میرا کیا لگے
ظلم بھی جس شخص کا اچھا لگے

کب سے ہے ہر لمحہ مصروفِ طواف
وہ صنم دل کو مرے کعبہ لگے

اپنی سب بے مہریوں کے باوجود
کس قدر وہ اجنبی اپنا لگے

امکان

چل پڑوں اس کی گلی کی سمت جب
دوپہر کی دھوپ بھی سایا لگے

جل اٹھے ہیں اس کی یادوں کے چراغ
آج اپنا گھر بھی گھر جیسا لگے

ہے سراپا سحر اس کی شخصیت
سوچئے اس کو تو وہ کیا کیا لگے

اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی شمیم
آرزو امڈا ہوا دریا لگے

۱۹۹۳ء

○

محبت سو دکھوں کی اک دوا ہے
وگرنہ زندگی حرفِ دعا ہے

اندھیرے کا تناسب بڑھ نہ جائے
کوئی سورج زمیں پہ آگرا ہے

ہمارا حال ہے اظہر من الشمس
جو سب کا حال ہے کس سے چھپا ہے

امکان

درِ کعبہ پہ بھی پہرے بٹھاؤ
بتوں کی واپسی کا مرحلا ہے

شکستہ پا سفر کی سمت کھو کر
مسافر راہ میں تنہا کھڑا ہے

در آئے جس کا جی چاہے در آئے
سدا سے دل کا دروازہ کھلا ہے

مسلسل آبجو میں بہتے بہتے
کنول کا پھول کچھ اکتا گیا ہے

جہاں صدیوں سے ہے پیاسوں کا میلہ
شمیم اس بزم کا شہرہ بڑا ہے

۱۹۹۰ء

حسن اک شخص میں اسیر سا تھا
عشق کرنا تو ناگزیر سا تھا

دھیان اِس کا تھا اک چبھن کی طرح
دل میں گویا وہ کوئی تیر تھا

تھی رگ و پے میں ایک ہلچل سی
جیسے ماحول دارو گیر سا تھا

امکان

اب ہے آباد میری آنکھوں میں
پہلے وہ کوئی جوئے شیر سا تھا

فکر و احساس پر تھی چھاپ اس کی
میرے شعروں کا وہ ضمیر سا تھا

کم نہ تھا عہدِ جوش و فیض شمیم
کوئی غالب سا کوئی میر سا تھا

۱۹۹۲ء

○

موسمِ عشق سازگار ہوا
مہرباں حسن کا دیار ہوا

رشتۂ درد استوار ہوا
دل کے زخموں کا پھر شمار ہوا

اک نئی صبح کا حسیں پرچم
افقِ جاں پہ آشکار ہوا

امکان

مسندم جہدِ زیست کے ہاتھوں
قلعۂ جبر کا حصار ہوا

جل گیا اپنی آگ میں راوَن
اپنے ہی شر کا خود شکار ہوا

سایۂ مرگ اپنے سر سے ٹلا
معتبر زندگی سے پیار ہوا

کتنے پیاسے تھے لب کہ آج شمیم
جامِ زہراب خوشگوار ہوا

اگست ۱۹۸۸ء

نذرِ بنجمن مولاسس

سوچا جو تم نے تھا سرِ مقتل وہ سب ہوا
ہم سے بھی اپنے جرم کا انکار کب ہوا

زنداں کے بام و در پہ لہو کے دیئے جلیں
منصب بھی یہ سپردِ اسیرانِ شب ہوا

اس کی بساطِ حسن کے کردار اور ہیں
ہم زیبِ داستاں ہیں یہ معلوم کب ہوا

امکان

مینائے مئے بھی ساغر زہراب بھر گئی
سیراب اس طرح بھی یہاں تشنہ لب ہوا

تاریک راستوں میں اجالوں کا شور ہے
مشعل نما سر آج کوئی نذرِ شب ہوا

مصلوب نغمہ گر ہوا عہدِ بہار کا
تابندہ تر شمیم حوالہ ادب ہوا

(جنوبی افریقہ کا انقلابی شاعر جسے جرم انقلاب میں پھانسی دی گئی)

۱۹۸۸ء

○

کیفیتِ شکستِ دلِ زار کچھ کہو
سونی ہے آج انجمنِ یار کچھ کہو

اے اہلِ درد جذب کرے گی زمینِ دل
کب تک یہ خونِ دیدۂ بیدار کچھ کہو

اس بار فصلِ گل کی عجب آن بان ہے
چھایا ہوا ہے ابرِ شرربار کچھ کہو

امکان

تاریکیوں میں ڈوب گیا روشنی کا شہر
ناپید پھر ہیں صبح کے آثار کچھ کہو

حرص و ہوس کی جیت ہوئی زندگی کی ہار
پھر نفرتوں کا گرم ہے بازار کچھ کہو

یہ صبح آرزو ہے کہ شامِ غمِ فراق
دامِ فریبِ شب کے گرفتار کچھ کہو

لب خشک ہیں شمیم مگر بیخودی کی بات
یارانِ میکدہ کا ہے اصرار کچھ کہو

۱۹۶۹ء

○

وہ آ گئے تو ہوئیں طے مسافتیں کیا کیا
کھڑی تھیں ورنہ انا کی عمارتیں کیا کیا

منائیں جشنِ بہاراں لہو کے دیپ جلائیں
ملی ہیں اہلِ قفس کو مراعتیں کیا کیا

پسند اس کو شفق رنگ کچھ نقوش ہوئے
کتابِ دل میں لکھی تھیں عبارتیں کیا کیا

امکان

ہے سنگ و خشت کی بارش پہ اکتفا اس بار
ہیں اس گلی کی وگرنہ روایتیں کیا کیا

ہماری بے گنہی کی ہمارے قتل کے بعد
صلیبِ وقت پہ ابھریں شہادتیں کیا کیا

خود اک حکایت پارینہ بن گئی ہے شمیم
وہ بزم نکلی تھیں جس سے حکایتیں کیا کیا

۱۹۸۶ء

چمن دل میں مرے پھول کھلاتے چلئے
ہاتھ میں ہاتھ دیئے گیت سناتے چلئے

ایک مدت سے ہے سنسان سا شہر احساس
فتنہ حشر بہ ہر گام جگاتے چلئے

مقتل حسن کا شاید کوئی ساتھی مل جائے
در میخانہ کی زنجیر ہلاتے چلئے

امکان

مشعلِ زخم لئے پرچمِ خوں رنگ لئے
دل کے ویرانے میں آواز لگاتے چلئے

ہمسفر پاؤں اٹھے رقص کے انداز کے ساتھ
سازِ زنجیر پہ نغمات سناتے چلئے

صفحۂ وقت پہ خونِ رگِ جاں سے اپنے
خوبصورت سا کوئی نقش بناتے چلئے

آخرِ شب ہے مگر قافلے والوں کو شمیم
اب بھی اندیشۂ شب خوں ہے ، جگاتے چلئے

۱۹۶۸ء

کہیں شب خوں کا اندیشہ نہیں ہے
یہ آغازِ سفر اچھا نہیں ہے

طلسمِ خامشی ٹوٹا نہیں ہے
مگر مقتل سا سناٹا نہیں ہے

خزاں کے لوٹ جانے کا ہے خدشہ
چمن دل کا ابھی اجڑا نہیں ہے

امکان

جو گردِ راہ میں منزل نہ دیکھے
کوئی صاحب نظر ایسا نہیں ہے

ہر اک شاخ شجر سے دکھ نہ برسے
ابھی وہ مرحلہ آیا نہیں ہے

سمندر تیرگی کا درمیاں ہے
سحر کا قافلہ بھٹکا نہیں ہے

ستارہ چھپ گیا ہے بادلوں میں
مسافر راستہ بھولا نہیں ہے

۱۹۸۶ء

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

اک کہکشاں بچی تھی کبھی آسمان پر
اس کہکشاں کے سارے ستارے بکھر گئے
خوابوں کے ساتھ ساتھ نظارے بکھر گئے

پیچیدہ تر مسائل شبہائے زیست ہیں
مینار روشنی کے دھندلکوں میں کھو گئے
مڑ کر جو دیکھا وقت کو پتھر کے ہو گئے

امکان

اب کارواں کو سمتِ سفر کا ہے مرحلہ
سب سنگِ میل راہِ وفا کے اکھڑ گئے
تاریخ کی ڈگر کے مسافر بچھڑ گئے

تپتی ہوئی زمین شعورِ حیات ہے
پیپل کی چھاؤں درد کا سورج نگل گیا
برگد کا کوئی پیڑ چمن میں نہیں رہا

خونِ جگر سے حرف کا چہرہ دمک اٹھے
اب فن کی سرحدوں کا تعین کرے کوئی
دامانِ زندگی کو مزین کرے کوئی

معیار و اعتبارِ ادب تیرگی میں ہے
ہے شہر فکر دیر سے شب کی پناہ میں
ذراتِ نور ڈھونڈیئے اب گردِ راہ میں

جون ۱۹۹۲ء

محبتوں کی زمیں قوتِ نمو چاہے
نسیمِ صبح سے خونِ رگِ گلو چاہے

غمِ فراق بتدریج کربِ ذات بنے
خیالِ وصلِ صنم ترکِ آرزو چاہے

تناؤ ہے رگ و پے میں سوا ہے تشنہ لبی
کچھ اور رند ابھی صحبتِ سبو چاہے

امکان

جنوں کی آگ میں خود آپ جل بھی سکتے ہیں
یہ کیا ضرور ہمارا برا عدو چاہے

بدن پہ کیا ہے سلامت کہ آج بخیہ گرو
کسی سے عرض کریں پیرہن رفو چاہے

وہ جانِ شعر کہ ہے شہریارِ شہرِ غزل
بیانِ شوق میں کچھ اور بھی غلو چاہے

صلیبِ فکر پہ معیارِ فن سجا آئے
مگر وہ اور ہی اندازِ گفتگو چاہے

گذاریں نذرِ دل و جاں کہاں تلک کہ شمیم
وہ صبح و شام تمناؤں کا لہو چاہے

۱۹۸۷ء

حسن حمیدی

تیرگیِ قسمتِ صاحب نظراں ہے پھر بھی
درِ ظلمت پہ سحر خیز جبیں خم نہ ہوئی
مصلحت چھو نہ گئی اس کے خلوصِ فن کو
شمعِ احساس گھڑی بھر کو بھی مدھم نہ ہوئی

مرحلے بارہا درپیش ہوئے جاں فرسا
شدتِ گرمیِ گفتار مگر کم نہ ہوئی
جراْتِ فکر و نظر اس سے پشیماں نہ ہوئی
اس کے فن سے کبھی تزئینِ شبِ غم نہ ہوئی

امکان

قصور ہے کہ سرشتِ ستم سمجھتے ہیں
یہ جرم ہے کہ رموزِ کرم سمجھتے ہیں

سکوتِ مرگ ہے ہر سو مگر ابھی کچھ لوگ
وقارِ عظمتِ لوح و قلم سمجھتے ہیں

شکستِ ساغرِ دل حسن کی روایت ہے
وگرنہ وہ بھی مآلِ ستم سمجھتے ہیں

مسیحِ وقت ہیں سقراطِ عہد ہیں ہم لوگ
کہاں لہو کی ضرورت ہے ہم سمجھتے ہیں

فریب مسلکِ یارانِ انجمن ہے شمیم
یہاں زبانِ محبت کو کم سمجھتے ہیں

بارشِ سنگ

چند ساعت کے لئے ہی سہی منظر بدلے
تیری آنکھوں میں مرا خواب بسیرا کر لے
میں بھی دیکھوں کبھی عکسِ دلِ پر خوں اپنا
تیرے رخ پر کبھی بکھرے مرے احساس کا رنگ
بعدازاں بارشِ تہمت ہو کہ ہو بارشِ سنگ

دستک

پہلے درِ خیال پہ دستک کسی نے دی
پھر جامِ التفات و توجہ اچھال کر
اس نے مکینِ میکدۂ حسن کر دیا
سرشاری و خمار، رگ و پے میں بھر دیا
پھر شہرِ آرزو کی فضائیں بدل گئیں
پیاسی زمیں پہ گویا گھٹائیں برس پڑیں
پھر یوں ہوا کہ سحرِ نظر معتبر ہوا
آنکھوں میں، دل میں، فکر میں بستے چلے گئے
میرے وجود میں وہ اترتے چلے گئے •

امکان

صرصر چلے کہ بادِ صبا اک سرور ہے
منظر کوئی ہو جوشِ نمو کا وفور ہے
کانٹے اگیں کہ پھول کھلیں شاخ پر شمیم
یہ موت کی شکست کا عنوان ہی تو ہے
زخموں کی فصل زیست کا امکان ہی تو ہے

افسانہ درافسانہ

خوشبوئے تکلم میری سانسوں میں ہے کس کی
اترے ہے نشہ آنکھوں کا کس کی رگ و پئے میں
مہکے ہے تمنا لب و رخسار کی کس کے
پلکیں میری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں کس کی
چہرہ میرے چہرے پہ سجا رہتا ہے کس کا
مچلے ہے کوئی نام لبوں پہ مرے ہر آن
دل ہے کہ کسی شخص کی تسبیح پڑھے جائے
افسانہ در افسانہ کہے جائے

وفا پہ اپنی کچھ اس درجہ اعتبار سا ہے
کہ اس کے جورِ مسلسل کا انتظار سا ہے

سکوتِ لب میں بھی ابلاغ کا ہے وہ عالم
زبان گنگ سی ہے ، حرف شرمسار سا ہے

عیاں ہمیشہ ان آنکھوں میں عزمِ قتل رہے
مجھے کچھ ان کی توجہ پہ اختیار سا ہے

گذرتا رہتا ہے ہر آن کاروانِ شرار
بڑے دنوں سے یہ دل ایک رہگذار سا ہے

لبوں پہ نام مچلتا ہے کس پری وش کا
شمیم کیسا رگ و پے میں یہ خمار سا ہے

۱۹۹۳ء

○

اک اجالا سا مرے من میں کسی نام کا ہے
حسن ہر سمت فروزاں سحر و شام کا ہے

خیمۂ جاں کے مسافر کا پتہ کیا پوچھیں
رہنے والا وہ کسی قریۂ بےنام کا ہے

ذکرِ رندانِ بلا نوش کبھی اور سہی
میکدے میں ابھی موسم غم و آلام کا ہے

میرے ساقی کو شکایت ہے مرے دل سے تو یہ
عکس آئینے میں ٹوٹے ہوئے اک جام کا ہے

حرمتِ حسن کی تسبیح کے باوصف شمیم
مستحق میرا جنوں تہمت و دشنام کا ہے •

امکان

○

وفا کا ذکر ہو بے مہری ۔ بتاں کی طرح
یہاں خلوص بھی ارزاں ہے نقدِ جاں کی طرح

کبھی جو حالِ دلِ خوں چکاں کا ذکر چلے
سنائیے انھیں رودادِ دیگراں کی طرح

سروں کے چاند فروزاں ہیں راہِ الفت میں
چمک رہی ہے زمیں آج کہکشاں کی طرح

کسی مسیح کے قدموں کی آہٹیں سن کر
صلیب جھوم اٹھی شاخِ آشیاں کی طرح

کہاں سے لائیے رعنائی ۔ خیال شمیم
سبوئے دل بھی ہے خالی سبوئے جاں کی طرح

۱۹۶۷ء

امکان

اپنی یادوں کی وہ مشعل نہیں بجھنے دیتا
کوئی لمحہ مجھے تنہا نہیں رہنے دیتا

قریۂ جاں میں ہے اس کے لب و رخسار کی دھوپ
اپنا سایہ میری جانب نہیں بڑھنے دیتا

مضطرب دیکھ کے وہ خود بھی تڑپ اٹھتا ہے
ایسی چاہت کو بھی چاہت نہیں کہنے دیتا

دیدہ و دل میں ہمہ وقت بسا رہتا ہے
اپنا چہرہ وہ نظر سے نہیں ہٹنے دیتا

فکر و احساس ہے مدت سے قلمرو اس کی
ذہن میں اور کوئی عنواں نہیں بسنے دیتا

۱۹۹۳ء

نذرِ سراج الدین ظفر

عمر بھر انجمنِ دل کے نمائندہ رہے
پھر بھی ہم بارگہہِ درد میں شرمندہ رہے

مسکراتی ہوئی آنکھیں وہ سلگتے ہوئے لب
ایسے ماحول میں مشکل ہے کوئی زندہ رہے

ذکرِ فردوسِ نگاراں ہی رہے آج کی شب
گفتگوئے دلِ پر خوں کبھی آئندہ رہے

خونِ دل سے مرے، ہنستی ہوئی گل رنگ جبیں
حلقۂ گیسو و رخسار میں تابندہ رہے

زندگی سر بہ گریباں رہی طوفاں سے شمیم
ان کی یادوں کے دیئے پھر بھی درخشندہ رہے

امکان

○

لہو سے دردمندوں کے افق گلفام ہو جائے
شبِ غم سے الجھنے کی تمنا عام ہو جائے

ہمارے زخمِ دل سے عظمتِ عہدِ بہاراں ہے
نہ پھول ایسے کھلیں تو گلستاں بدنام ہو جائے

چراغاں بھی کریں گے قاتلوں کے خوں سے مقتل میں
ابھی تو ظلم کا سورج ہے سر پر، شام ہو جائے

سروں کی مشعلوں سے اہلِ دل راہِ محبت میں
صلیبوں کو سجا دیں زندگی خوش نام ہو جائے

شمیم اب دیکھئے کیا ہو متاعِ ذہنِ شاعر بھی
یہ خدشہ ہے کہ نذرِ حرمتِ اصنام ہو جائے

۱۹۶۱ء

○

سروں کے پھولوں سے آرائشِ بہار کریں
یہ کام حسبِ روایت وفاشعار کریں

جگر فگار کریں جان و دل نثار کریں
کہیں تو آپ تماشہ یہ بار بار کریں

لہو کو رنگ کہیں زخمِ دل کو پھول کہیں
ہے حکم، طرزِ بیاں اور خوشگوار کریں

زبانِ درد بنیں رہزنوں کے گیت لکھیں
ستم گرِ شہر میں کیا ریت اختیار کریں

دل و نظر کی طرح ہم سے شرمسار سی ہے
یہ آرزو بھی کہ ہم زندگی سے پیار کریں

۱۹۶۴ء

امکان

○

حالاتِ روز و شب جو ذرا مختلف ہوئے
اپنے گھروں میں اہلِ نظر معتکف ہوئے

کچھ لوگ آج کوئے ملامت میں آئے ہیں
عرصہ گزر گیا تھا جنھیں منحرف ہوئے

سچائیوں کے خون سے تر ہو نہ آستیں
اس وضعِ احتیاط کے سب معترف ہوئے

شہرِ ہوس میں اہلِ ہوس بھی ملے ملول
اس بار واردات بڑے مختلف ہوئے

تھا کاروانِ صبح کی آمد کا اہتمام
شب خوں پڑا تو راز کئی منکشف ہوئے

۱۹۸۷ء

امکان

چراغِ دل کی لو مدہم نہیں ہے
کہ شانِ نارسائی کم نہیں ہے

سلگ اٹھے نہ تیرا دامنِ دل
یہ آنسو قطرۂ شبنم نہیں ہے

یہ کیا کم ہے کہ اس فصلِ ہوس میں
صبا گلشن میں نامحرم نہیں ہے

سروں کی مشعلوں کا تذکرہ ہے
سکوتِ شب کا وہ عالم نہیں ہے

شمیم اب حالِ دل کہیئے نہ کہیئے
کہ مفہومِ نظر مبہم نہیں ہے

۱۹۶۴ء

امکان

لوٹ آئی ہے نظر بارہا ایوانوں سے
کتنی مانوس ہے اجڑے ہوئے کاشانوں سے

ان کو گمراہیِ احساس کا غم کیا ہو گا
طالبِ نورِ سحر ہیں جو شبستانوں سے

آج کچھ اہلِ ہوس بھی ترا غم رکھتے ہیں
ہم نے یہ بات سنی ہے ترے دیوانوں سے

زیست آرائشِ زنداں و سلاسل ہے ہنوز
کوئی یہ تلخ حقیقت کہے فرزانوں سے

آج بھی قتل گہہ حسن میں قائم ہے شمیم
عظمتِ جنسِ وفا چاک گریبانوں سے

۱۹۶۶ء

○

ان کے جلوے بھی جنوں کی کہکشاں تک آگئے
برق کے شعلے حدودِ آشیاں تک آگئے

خونِ بسمل پر اڑھایا ظلمتِ شب نے کفن
ہم فسانہ بن کے خنجر کی زباں تک آگئے

کچھ نقوشِ دستِ قاتل کچھ شمیمِ خونِ دل
گلستاں دامن میں لے کر گلستاں تک آگئے

جانِ جاں اب اعتبارِ عظمتِ غم کیجیے
دیکھیے خود آپ دل کے آستاں تک آگئے

جستجو کعبے کی تھی لیکن نہ جانے کیوں شمیم
چلتے چلتے ہم درِ پیرِ مغاں تک آگئے

۱۹۶۵ء

تیری دلنواز باتیں ، تری دلنشیں ادائیں
تری آرزو میں کیسے نہ جہاں کو بھول جائیں

کوئی گیت گنگنائیں ، کہ غزل کوئی سنائیں
ترے گیسوؤں کے سائے میں یہ سوچ بھی نہ پائیں

یہ نہ جانے آج کس نے درِ دل پہ دی ہے دستک
یہ جو اٹھ رہا ہے طوفاں اسے کس طرح دبائیں

یہ نوازش جنوں ہے کہ فسوں تری نظر کا
یہ مطالبہ ہے دل کا ابھی اور فریب کھائیں

تری انجمن میں اب بھی ہیں شمیم اجنبی سے
کسے رازداں بنائیں کسے زخمِ دل دکھائیں

۱۹۶۰

زندگی زندگی

زندگی وقت کی مانندِ ترو تازہ ہے
صفحۂ آب پہ جیسے کوئی شاداب کنول
خس و خاشاکِ ستم ہوگئے فضا میں تحلیل
ارتقاء درد کے صحرا میں ہے سر گرمِ عمل
زندگی وقت کی مانند ہے مصروفِ خرام
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے فردوسِ غزل
چمنِ حسن و محبت کا گلِ خوشتر ہے
زندگی ایک تسلسل کا حسیں پیکر ہے
جنتِ اہل ہوس قصۂ یک ساعت ہے
زندگی وقت ہے اور وقت بڑی طاقت ہے

○

غمِ حیات لبِ شعلہ بار تک پہنچا
ہمارا ذہن حدِ اعتبار تک پہنچا

فسوں یہ کس کی نظر کا بہار تک پہنچا
سکوتِ لالہ و گل انتشار تک پہنچا

بھٹک رہا تھا جنوں رہگذارِ ہستی میں
نہ جانے کب یہ خمِ زلفِ یار تک پہنچا

سب اہلِ بزم مرے حسنِ شعر تک پہنچے
مگر نہ کوئی دلِ سوگوار تک پہنچا

یہ کس نے چھیڑ دیا سازِ آرزوئے وصال
یہ آج کون اس اجڑے دیار تک پہنچا

۱۹۶۰ء

تناظر

تھا دیر سے حیات کا ماحول شب نما
بوجھل فضائے ذہن تھی چہرہ ملول تھا
ان مہرباں لبوں کی مسیحانفسی کا
اعجاز دیکھئے کہ تناظر بدل گیا
احساس انبساط رگ و پے میں بس گیا
پژمردہ پھول جاں کا کھلا اور مہک اٹھا
دستِ صبا میں ساغر صہبا چھلک گیا
فردوس برزمیں کا تصور نکھر گیا

اپریل ۱۹۹۲ء

گفتگو

شبنم سے گفتگو ہے بہاروں سے گفتگو
خوابوں میں جیسے چاند ستاروں سے گفتگو
سروِ جمال جوئے محبت سے ۔ گفتگو
اس سے مکالمات ہیں فطرت سے گفتگو

وہ ہمکلام ہو تو گھٹا معتبر لگے
یکجا بہت قریب سے شام و سحر لگے
ہر حرف اس غزال کا جادو اثر لگے
اس کے گلابِ لب کو نہ یا رب نظر لگے

مدو جزر

کب اجنبی سا لگے کب لگے عزیز از جاں
وہ مد و جزر پہ غلبہ کمال رکھتا ہے
متاعِ درد میسر رہے غزل کو مری
وہ اپنی ذات میں فن کا جمال رکھتا ہے
ہرا ہی زخم رہے دل کا کوئی موسم ہو
وہ میرے کرب کا کتنا خیال رکھتا ہے

مارچ ۱۹۹۲ء

کریش

ہو مرحلہ صلیب کا یا دشتِ کربلا
قائم رہے ہمیشہ محبت کے دین پر
یہ سوچ کر وجود سراپا ہے اک سوال
کتنا ہمیں یقین تھا اپنے یقین پر
ہر خواب چور چور ہے احساس پاش پاش
کتنی بلندیوں سے گرے ہیں زمین پر

اگست ۱۹۹۱ء

محاسبہ

ارضِ چمن پہ کب سے اندھیروں کا راج ہے
ٹوٹا کبھی تو لمحے کو ، شب کا محاصرہ
ہوتا رہا ہے نورِ سحر کا محاسبہ
ہر کربلا کے بعد پھر اک اور کربلا
خونِ صبا ، کہ خونِ تمنا ، کہ خونِ جاں
جب بھی یہاں چراغ جلا خون سے جلا

مارچ ۱۹۹۱ء

تصویر

مکالمات تیری یاد سے رہے ہر آن
اک اضطرابِ مسلسل سے دل الجھتا رہے
میں جب بھی چاہوں کہ ٹوٹے تیرے جمال کا سحر
تیرا خیال سوا اور جگمگانے لگے
کچھ اور پیار سے تصویر مسکرانے لگے
جبیں دمکنے لگے ، آنکھ گنگنانے لگے

مئی ۱۹۹۲ء

استحقاق

تاج محل سے عشق ہے سب کو تاج محل تو سب کا ہے
سب آنکھیں اٹھتی ہیں اس پر تنہا اپنی پریت نہیں
حسن کا وہ ایک تاج محل ہے جس سے میں نے پیار کیا
چاہت اپنی منزل ٹھہری منزل اپنی جیت نہیں
حسن پہ استحقاق جتانا شہر وفا کی ریت نہیں

اپریل ۱۹۹۲ء

غزل اداس رہی

تھی بزم شوق میں بے نام سی کمی کی فضا
وہ آیا دل نے کی محسوس روشنی کی فضا
وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا شاعری کی فضا
گیا تو ساتھ گئی اس کے زندگی کی فضا
تھا فن کدے میں اندھیرا سا ایک پل کے لئے
غزل اداس رہی دیر تک غزل کے لئے

اپریل ۱۹۹۲ء

بال روم

یہ رقص گاہ جہاں لوگ غم سے کترا کر
پناہ ڈھونڈنے آتے ہیں رنگ و نکہت میں
حسین باہنیں کشادہ ادائیں چشم براہ
زمین کے لوگ ہیں سرگوشیوں کی جنت میں
شبِ خموش، دہکتے ہوئے لب و رخسار
گداز جسم کی جنبش کہ فتنۂ بیدار

امکان

نظر اٹھائیں تو محشر نظر جھکائیں تو قتل
یہ مہہ جبینوں کی محفل یہ مہوشوں کا جمال
عجیب کیفیت بےخودی و مستی ہے
روش روش پہ ابھرتا ہے شاعری کا خیال
یہ قہقہوں کا فسوں ہے کہ پڑ رہی ہے پھوار
سلگ رہی جوانی برس رہا ہے خمار

یہ رقص گاہ خدایانِ زر یہاں ہر شب
ہوس کا زہر لئے جامِ دل میں آتے ہیں
یہ لوگ سینکڑوں مریم کی آبرو کا مذاق
اڑا کے برسرِ مجلس خراج پاتے ہیں
یہ بزمِ عیش و طرب ننگِ آدمیت ہے
میرے سماج کی یہ دکھ بھری حکایت ہے

یہ رقص گاہ غریبوں کی مفلسی پر طنز
خلوصِ نیتِ اہلِ کرم کا حاصل ہے
یہاں سماج کی عظمت کا خون ہوتا ہے
یہ ذلتوں سے بھری زندگی کی منزل ہے
ہوس کی دھن پہ یہاں ظلم رقص کرتا ہے
یہیں سے حسنِ سحر کا یقیں نکھرتا ہے

۱۹۶۱ء

آہ ! انور

وہ حادثہ وہ ایک المناک سانحہ
کتنے سروں کی جس نے گھنی چھاؤں چھین لی
کتنے دلوں کی جس نے تمنائیں روند دیں
جس نے کئی نگاہوں کو ویران کر دیا
جس حادثہ نے مانگ کس کی اجاڑ دی
جس حادثہ میں چاند کسی گھر کا بجھ گیا
وہ حادثہ وہ ایک المناک سانحہ

امکان

جس حادثہ نے خواب سہانے کچل دیئے
خرمن مسرتوں کے دمِ صبح جل گئے
سب روز و شب کے خوشنما منظر بکھر گئے
پل بھر میں آرزوؤں کے گلشن اجڑ گئے
رستے میں روشنی کا سفر ختم ہو گیا
لمحوں میں زندگی کا سفر ختم ہو گیا
وہ حادثہ وہ ایک المناک سانحہ

جس سانحہ کا زخم رہا سر ہنیں رہا
انور ہماری آنکھوں کا تارا ہنیں رہا

(بیگم مسلم شمیم کا جواں سال بھانجہ جو ۱۷ مئی ۹۴ء کو دہران سعودی عربیہ میں ایک کار کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔

آرزو کی بستی

اسے خبر ہے مری آرزو کی بستی میں
اندھیری رات بہت دیر تک نہیں رہتی
یقیناً وصل کی مشعل کبھی نہیں بجھتی
میں اس کو سوچوں تو ظلمت سمٹنے لگتی ہے
اجالے پھوٹنے لگتے ہیں خود رگ و پے میں
ستارے جیسے اتر آئیں ساغرِ مے میں

امکان

اسے خبر ہے مری آرزو کی بستی میں
جو چاندنی ہے وہ عکسِ جمال ہے اس کا
جو کوئی چاند مکیں ہے وہ اس کا چہرہ ہے
جو کوئی کاہکشاں سی ہے میری راہوں میں
وہ اس کے عارض و لب کی شفق طرازی ہے
وہ اس کی جھیل سی آنکھوں کی سحرسازی ہے

مجھے خبر ہے مری آرزو کی بستی کی
فضا اداس ہوئی ہے کبھی تو خود اس نے
دیارِ دل کے در و بام کو صدا دی ہے
چراغِ درد کی لو اور تیزتر کر کے
سلگتے رہنے کی اس شخص نے دعا دی ہے
دیئے کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے

اگست ۱۹۹۴ء

آہ! الینا

موت سے لڑتے لڑتے آخر زیست کی ڈوری چھوٹ گئی
ٹوٹ گئی زنجیر نفس ، زنجیر تمنا ٹوٹ گئی
میرے سپنوں کی دھرتی کی بیٹی مجھ سے روٹھ گئی
بیٹی مجھ سے روٹھ گئی یا روشنی جاں روٹھ گئی

آرزوؤں کے تانے بانے کن تاروں سے جوڑ گئی
سب کا دکھ سکھ بانٹنے والی دکھ سکھ سے منہ موڑ گئی
سارے رشتے توڑ گئی پر درد کا رشتہ چھوڑ گئی
چھوڑ کے سارے خواب ادھورے اپنے گھر کو لوٹ گئی
روپ نگر کی راج کماری روپ نگر کو لوٹ گئی

فروری ۱۹۹۴ء

(روسی نژاد بہو کے سانحہ ارتحال پر قلم برداشتہ کہی گئی۔)

متاعِ جاں

نگاہ اس کی وفاؤں کی ترجماں ہے مری
وہ جس قدر بھی ہے میری ، متاعِ جاں ہے مری
متاعِ فکر ہے میری متاعِ فن ہے مری
دل انجمن ہے وہ توقیرِ انجمن ہے مری
میں پیرہن ہوں وہ خوشبوئے پیرہن ہے مری

وہ روشنی ہے محبت کی روشنی ہے مری
وہ روحِ شعر ہے ، وہ وجہ شاعری ہے مری
وہ میرا لمحۂ موجود ، زندگی ہے مری
حیاتِ عشق کی تکمیلِ داستاں ہے مری
وہ جس قدر بھی ہے میری متاعِ جاں ہے مری

•

نذرِ جمیل مظہری

حدیثِ عظمتِ دردِ محبت کہکشاں تک ہے
مرے سوزِ دروں کا تذکرہ یارو کہاں تک ہے

وجودِ آدمی اک سایۂ سروِ رواں پھر بھی
اسی سے گرمیٔ ہستی زمیں سے آسماں تک ہے

ہراساں اپنے گرد و پیش سے ہے سایۂ گل بھی
یہ اندازِ طرب مخصوص میرے آشیاں تک ہے

مری رعنائیٔ افکارِ نو تک ہر نظر پہنچی
کم ایسے ہیں نظر جن کی مرے سوزِ نہاں تک ہے

ابھی تک زندگی کی دھڑکنیں، بیگانۂ فن ہیں
ابھی اپنی غزل، مسلم خمِ زلفِ بتاں تک ہے

۱۹۵۹ء

غلبہ پسِ غلبہ

غمِ حیات کا غلبہ اگر بڑھا ہے کبھی
تمہاری یاد سے خالی جو دل ہوا ہے کبھی
تو کوئی سمتِ سفر مطمحٔ نظر نہ رہے
جمالِ شام و سحر مرکزِ نظر نہ رہے
کتابِ جاں کا کوئی حرف معتبر نہ رہے
کوئی طلب نہ رہے کوئی مدعا نہ رہے
کہ جیسے سانسوں میں احساس کی فضا نہ رہے

اکتوبر ۱۹۹۴ء

رابطہ

رابطہ تارِ نظر کا تیرے چہرے سے کبھی
قطع ہونے ہنیں پاتا ہے کروں کیا جاناں !
ہے یہی رسم و تقاضائے جنوں کیا جاناں !
میری پلکوں پہ سجا ہے تیرا منظر جاناں !
میری آنکھوں میں۔ بسا ہے تیرا پیکر جاناں
گوشۂ دیدۂ بیدار تیرا گھر جاناں

مئی ۱۹۹۲ء

ہمسفر

سر چشمۂ خیال بھی موضوعِ شعر بھی
حرفوں کا آگہی کا سفر ساتھ ساتھ ہے
آنکھیں ہیں اس کی جھیل ستاروں کے دیس کی
سائے کا روشنی کا سفر ساتھ ساتھ ہے
وہ حسن کی کتاب ورق در ورق گلاب
خوشبو کا زندگی کا سفر ساتھ ساتھ ہے

۱۹۹۲ء

جزیرہ

جنوں بخشا ہے جن آنکھوں نے ہم کو
ان آنکھوں میں چراغ آگہی ہے
حسیں تر دلنشیں تر زندگی ہے
جزیرہ تیرگی کا جس کو سمجھوں
وہاں تو روشنی ہی روشنی ہے

۸۔۲۔۱۹۹۲ء

خواب نما

لب و رخسار ہیں کیفیتِ صہبا کے سفیر
اس کی تابندہ جبیں لوحِ دعا ہو جیسے
جس پہ تحریر فقط حرفِ وفا ہو جیسے
نظریں کھو جاتی ہیں ان زلفوں میں ان آنکھوں میں
چہرہ وہ آئینۂ خواب نما ہو جیسے
رنگ اور نور کی اوڑھے وہ ردا ہو جیسے

خواب چہرہ

لب و رخسار ہیں کیفیتِ صہبا کے سفیر
اس کی تابندہ جبیں لوحِ دعا ہو جیسے
جس پہ تحریر فقط حرفِ وفا ہو جیسے
فکر کھو جاتی ہے ان زلفوں میں ان آنکھوں میں
چہرہ وہ آئینہ خواب نما ہو جیسے
رنگ اور نور کی اوڑھے وہ ردا ہو جیسے

۱۹۹۲ء

نشان

میں اس کے دل کا بوجھ بنوں جس کو جاں کہوں
اس سانحہ کو کیسی محبت کا نام دوں
احساسِ جرمِ عشق سزا کی طلب کرے
خود حسن اس کی دیکھئے تائید کب کرے
حرفِ وفا کو کیسی بلندی نصیب ہے
ہر فکر کی جبیں پہ نشانِ صلیب ہے

اپریل ۱۹۹۲ء